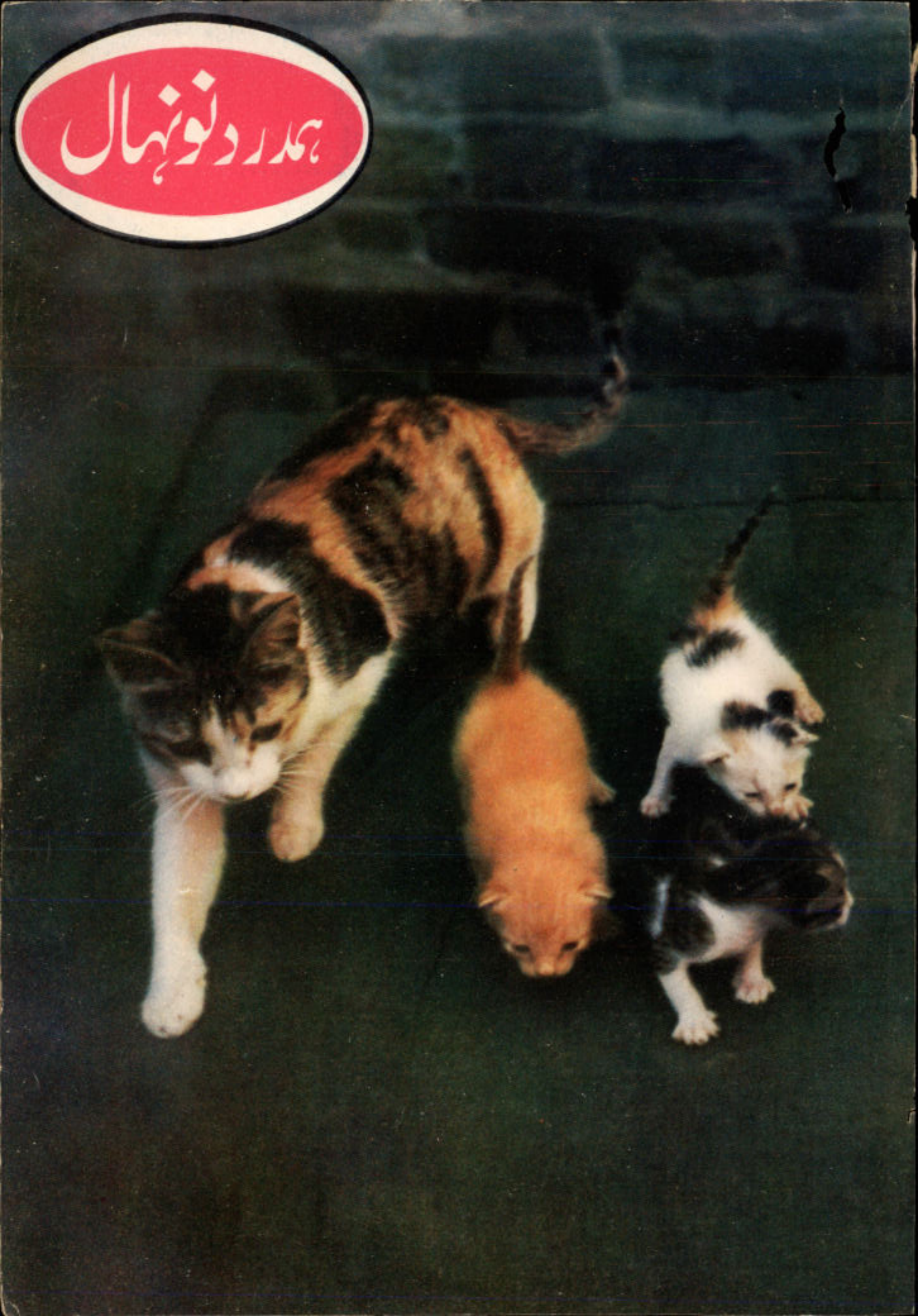
ہمدرد نونہال




شیر خوار بچوں کی صحت مندی کیلئے ماں کی ماامتا اور
ہمدردس
گرائپ واٹر
یکساں ضروری ہے
نومولود بچوں کو صحت مند رکھنے اور غیر ضروری تکالیف سے بچانے کیلئے انہیں ہمدردس گرائپ واٹر دیجئے۔ ہمدردس گرائپ واٹر ایک قابل اعتماد مرکب اور مجرب گھریلو دوا ہے جو ننھے منھے بچوں کو مندرجہ ذیل شکایات سے بچائے رکھتا ہے۔ ہاضمے کی خرابیاں مثلاً نفخ شکم، صفرادیت، اعضا کی اینٹھن اور تشنجی کیفیت وغیرہ۔ اسکے علاوہ بچوں کو دانت نکالنے میں آسانی بہم پہنچاتا ہے اور اس سے متعلق بیماریوں سے بچاتا ہے۔ جن بچوں کو پابندی سے ہمدردس گرائپ واٹر دیا جاتا ہے وہ تندرست اور زیادہ چونچال رہتے ہیں۔
ہمدرد
ہمدرد (وقف) لیبوریٹریز
کراچی لاہور ڈھاکہ چٹاگانگ
Hamdard's
GRIPE WATER

نومبر ۱۹۶۵ء

مدیر اعلا: حکیم محمد سعید

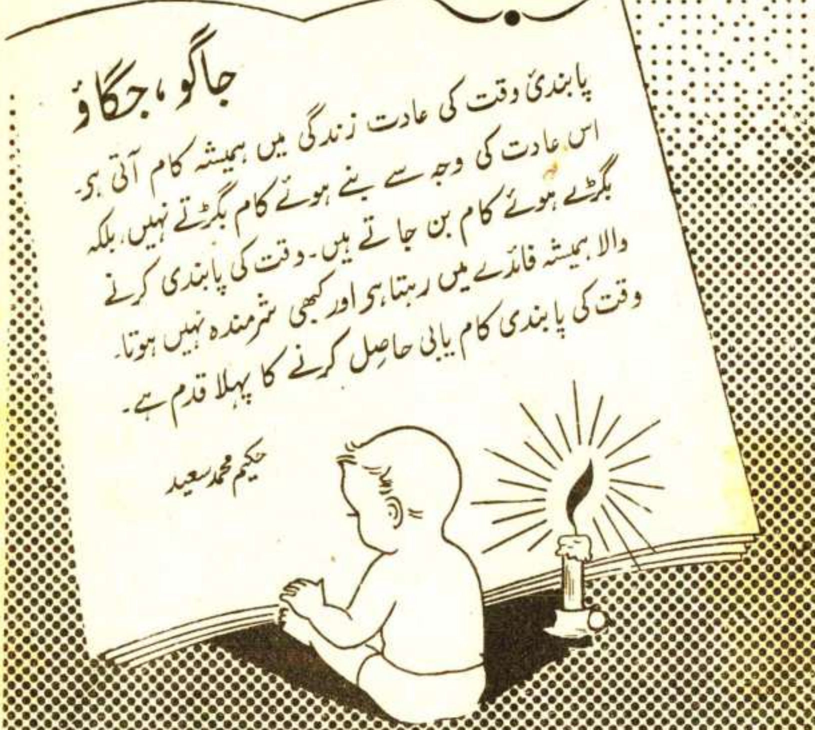
مدیر معاون: مسعود احمد برکاتی

فون: ۴۷۷۷۵

شمارہ ۱۱ جلد ۱۲

دفتر ہمدرد نونہال
ہمدرد ڈاک خانہ، کراچی ۱۵

ہمدرد نونہال



قیمت:— ایک رسالہ: ۷۵ پیسے — سالانہ: آٹھ روپے

سرورق کی تصویر از فوٹوپ، منٹگمری

پاکستان ہمیشہ سلامت رہے گا

مسعود احمد برکاتی

ستمبر کے شروع میں ہمارے پیارے پاکستان کو ایک سخت آزمائش سے گزرنا پڑا۔ ہمارے ایک ہم سایہ ملک نے پاکستان پر یکایک حملہ کر دیا، اور حملہ بھی چُپ چُھپاتے کیا۔ ہم سایوں سے لڑنا کیسی بُری بات ہے، لیکن اللہ کا شکر ہے، ہم اس آزمائش میں پورے اترے اور ہماری بہادر فوجوں نے جان پر کھیل کر اپنے وطن کی حفاظت کی اور دشمن کو نیچا دکھایا۔ فتح پاکستان کی ہوئی۔

وطن کا ایک ایک ذرّہ مقدّس ہوتا ہے، اپنے وطن کا بچاؤ کرنا ہر محبِ وطن کا فرض ہوتا ہے۔ ہر پاکستانی نے اپنے پاک وطن کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی بساط بھر کوشش کی۔ جوانوں کے علاوہ بوڑھوں، عورتوں اور بیماروں نے یہاں تک کہ نونہالوں نے بھی پاک پرچم کو بلند رکھنے میں اپنی حکومت اور اپنی فوجوں کی مدد کی۔ آپس کے جھگڑے بھلا دیے، سب شیر و شکر ہو گئے۔ پاکستان کے بچاؤ کے لیے، بزدل دشمن کو کچلنے کے لیے سارے پاکستانی ایک دل اور ایک جان ہو گئے۔ پاکستان سے باہر بھی دوست ملکوں نے پاکستان کی حمایت کی، مدد کی، دوست وہی ہے جو وقت پر کام آئے۔

آئندہ کے لیے بھی پاکستان کے دشمن یہ سمجھ لیں کہ پاکستان کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے گا تو قوم کا بچّہ بچّہ اس کا منھ توڑ جواب دے گا اور دس کروڑ پاکستانیوں کو ختم کر کے ہی کوئی دشمن پاکستان میں قدم رکھ سکے گا۔ ہم تعداد میں کم ہیں، ہماری طاقت بھی کم ہے، لیکن ہمارا اسلامی جذبہ اور ہماری فوجوں کی بہادری، ہمّت اور وطن سے محبّت پاکستان کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

اس تجربہ کے بعد ہمیں پاکستان کو مضبوط بنانے کے لیے پہلے سے زیادہ جوش اور زیادہ محنت کے ساتھ کام کرنا ہے۔ اپنے کو صحت مند اور اپنے ملک کو اتنا طاقت ور بنانا ہے کہ کوئی اس کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکے، اور ہم انشاءاللہ ایسا کریں گے۔

وطن کا سپاہی

قمر ہاشمی



صفوں میں ہے دشمن کے کتنی تباہی
ہمارے محاذوں نے دی ہر گواہی
بہادر ہے کتنا وطن کا سپاہی
سویرے نے کاٹی ہر شب کی سیاہی
بہادر ہے کتنا وطن کا سپاہی

نظر اس کی شاہین سے کم نہیں ہے
جھپٹنے میں کنجشک بے دم نہیں ہے
ارادے میں تھوڑا سا بھی خم نہیں ہے
کہ ہے منزلِ کامرانی کا راہی
بہادر ہے کتنا وطن کا سپاہی



بڑھا پرچمِ پاک لے کر بڑھا ہے
شجاعت، یقیں، عزم اور حوصلہ ہے
ظفر ہم رکاب اس کی، حامی خدا ہے
ہر آفت سے محفوظ رکھنا الٰہی
بہادر ہے کتنا وطن کا سپاہی

ہم بھی چلیں گے ساتھ

انور شعور



ہم بھی چلیں گے ساتھ ، اکیلے نہ جائیے
ابا ہمیں بھی فوج میں بھرتی کرائیے

ہم اہلِ حق ہیں ، حق کی حمایت کریں گے ہم
میدان میں لڑائی کی ہمّت کریں گے ہم
ہر طرح دشمنوں کی مرمّت کریں گے ہم
ہم بھی چلیں گے ساتھ ، اکیلے نہ جائیے
ابا ہمیں بھی فوج میں بھرتی کرائیے

ہم لوگ دشمنوں کی وہ دُرگت بنائیں گے
وہ جیل میں نہیں تو جہنّم میں جائیں گے
دشمن ہمارے ہات سے بچنے نہ پائیں گے
ہم بھی چلیں گے ساتھ ، اکیلے نہ جائیے
ابا ہمیں بھی فوج میں بھرتی کرائیے

مانا جو دَم ہے آپ میں ہم میں وہ دَم نہیں
شامل ابھی اگرچہ جوانوں میں ہم نہیں
لیکن بہادری میں جوانوں سے کم نہیں
ہم بھی چلیں گے ساتھ ، اکیلے نہ جائیے
ابا ہمیں بھی فوج میں بھرتی کرائیے



ننھے مجاہد

محمد احمد سبزواری

فوج ہمارے مقدّس وطن کی حفاظت کرتی ہے، اسی وجہ سے فوج کے ہر سپاہی کو ہمیشہ عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، لیکن امن کے زمانے میں ان کے کارنامے ہماری نظروں کے سامنے نہیں آتے، لیکن جب ملک پر کوئی نازک وقت آتا ہے، تب اس کے سچّے جوہر کھلتے ہیں۔ ستمبر میں پاکستان پر بھی ایک مشکل گھڑی آئی، جب اس مہینے کی چھٹی تاریخ کی تاریک رات کو ایک ایسے دشمن نے چپکے سے ہم پر حملہ کر دیا، جس کی فوجی طاقت، آبادی اور دوسرے ذرائع ہم سے بہت زیادہ تھے۔ دشمن نے مغربی پاکستان کے چند شہروں، مثلاً لاہور، سیال کوٹ اور قصور پر قبضہ کر لینے کا پروگرام بنایا تھا۔ یہاں اس نے بھاری فوج سے حملہ کیا اور اس کے ہوائی جہازوں نے اس کی فوج کی مدد کی۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے ہوائی جہازوں نے سرگودھا، پشاور، کراچی اور راولپنڈی وغیرہ پر ہوائی حملے شروع کر دیے۔ بعض جگہ اس نے شہری علاقوں میں ایک ہزار پونڈ وزن کے بم گرائے۔ اس کے ان اچانک حملوں سے بہت سے بے گناہ شہری، عورتیں اور بچّے شہید ہو گئے۔ مکان گر گئے، مویشی مر گئے، کھیت تباہ ہو گئے، گرجے بالکل برباد ہو گئے۔ اس وقت ہماری زمینی اور سمندری فوج اور ہوائی بیڑہ سب بجلی کی طرح حرکت میں آ گئے اور انھوں نے نہ صرف دشمن کا اچانک حملہ روک دیا، بلکہ اس کو پیچھے ڈھکیلتے ہوئے خود دشمن کے بہت بڑے

علاقے پر قبضہ کرلیا۔ اس کے ایک سو دس ہوائی جہاز تباہ کر دیے۔ سینکڑوں ٹینکوں اور توپوں کو بے کار کر دیا اور بہت سے سامان پر قبضہ کرلیا۔

پاکستانی فوج کے یہ دلیرانہ اور بہادرانہ کارنامے دیکھ کر ساری دنیا حیران رہ گئی۔ ملک کا بچّہ بچّہ ان کے کارناموں پر فخر کرنے لگا۔ فوج کے سپاہیوں کی ہر دل عزیزی، محبّت اور پیار میں بے حد اضافہ ہوگیا۔ میں نے دیکھا ہے کہ جب ہماری فوج کے بہادر سپاہی اپنی گاڑیوں میں دیہات کے قریب سے گزرتے ہیں تو چھوٹے چھوٹے بچّے سڑک کے دونوں جانب کھڑے ہوکر ان کو فوجی انداز سے سلام کرتے ہیں اور پاکستانی فوج زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں۔ عوام اور چھوٹے بچّوں کو اپنے فوجی بھائیوں سے جو محبّت ہوگئی ہے، اس کا اندازہ ان واقعات سے لگایا جاسکتا ہے:

دن کا وقت تھا، ایک شہر پر دشمن کے ہوائی جہازوں نے حملہ کیا۔ ہمارے جاں باز ہوا باز بھی فوراً مقابلے پر آگئے۔ ان کو دیکھتے ہی دشمن کے ہوائی جہاز دُم دبا کر بھاگے، مگر بھی انھوں نے دشمن کے ایک جہاز کو اپنا نشانہ بنالیا۔ اس میں آگ لگ گئی اور وہ نیچے گرنے لگا۔ ایک چار سالہ بچّی، جس کا چچا ہوائی فوج میں ہے، اس نے بھی گرتا ہوا جہاز دیکھ لیا۔ وہ چیخی اور تالیاں بجا کر کہنے لگی، "امّی، وہ دیکھیے، چچا جان نے دشمن کے جہاز کو مار گرایا۔"

لاہور جنرل پوسٹ آفس پر کچھ سپاہی ایک جیپ میں سوار کسی کام سے آئے۔ ان کو چند خواتین نے دیکھ لیا اور وہ ان کے لیے کچھ پھل اور مٹھائی لے آئیں۔ اسکول کی چند لڑکیاں سڑک سے گزر رہی تھیں، انھوں نے جو یہ دیکھا تو جلدی جلدی کولڈ ڈرنک کی بوتلیں لے آئیں اور اصرار کیا کہ سپاہی ان کو پییں۔ اتفاق سے ایک چھے سات سال کا لڑکا بھی وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس نے یہ منظر دیکھا۔ وہ اسی وقت تین چار آنے کی ٹافیاں خرید کر لایا، اس نے وہی سپاہیوں کو پیش کیں۔ فوجی اس بچّے کے خلوص سے

بے متاثر ہوئے اور انھوں نے ٹافیاں لینے سے انکار کر دیا۔ بچہ رونے لگا۔ بڑی مشکل سے اس کو سمجھایا اور اپنے پاس سے کچھ پھل اور مٹھائی دے کر اور اس کو پیار کر کے رخصت کیا۔

لاہور کے ایک بازار میں ایک جیپ رکی اور دو فوجی اس میں سے اترے۔ لوگوں نے فوراً ان کو گھیر لیا۔ نعرۂ تکبیر، پاکستان زندہ باد، صدر ایوب زندہ باد، ہمارے فوجی شیر زندہ باد کے نعرے لگانے لگے۔ جب ذرا جوش کم ہوا تو فوجیوں نے ان کی محبت اور خلوص کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ہم جلدی میں ہیں۔ ایک ضروری کام سے آئے ہیں، لہٰذا ہمیں جانے دیجیے۔ کسی نے پوچھا، "کیا کام ہے؟" انھوں نے کہا کہ ہم کچھ پنسلیں خریدنے آئے ہیں۔ چناں چہ لوگ پنسلیں خریدنے دوڑے اور دو تین منٹ میں درجنوں پنسلوں کا ڈھیر لگ گیا۔ ایک صاحب نے منع کرتے کرتے پھلوں کا ایک ٹوکرا جیپ میں رکھ دیا۔ فوجیوں نے سلام کیا اور رخصت ہوئے۔ گاڑی چلی کہ ایک سات آٹھ سال کا بچہ دو ہار لیے گاڑی کے سامنے آگیا۔ گاڑی پھر رکی۔ بچہ جیپ میں چڑھا اور دونوں فوجیوں کے گلے میں ہار ڈال کر اتر آیا۔ اب فوجیوں کی باری تھی۔ وہ اترے، بچے کو اٹھا کر سینے سے لگایا، اس کا ماتھا چوما اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گئے۔

اس لڑائی میں ہمارے بہت سے فوجی بھائی زخمی ہو گئے ہیں۔ چناں چہ جگہ جگہ کالجوں، اسکولوں اور مختلف انجمنوں کی جانب سے ان کے لیے گرم کپڑے، سوئیٹر، موزے، طبی امداد کا سامان، دوائیں، ٹرانسسٹر، کتابیں، رسالے اور اسی قسم کی دوسری ضروری چیزیں جمع کی جا رہی ہیں اور ان میں طلبا اور طالبات پیش پیش ہیں۔ پشاور یونی ورسٹی کے طالب علموں نے شہری حفاظتی دستوں میں کام کیا، عوام کے لیے خندقیں کھودیں، فوجیوں کے لیے گرم کپڑے، چندے اور خون کے عطیات دیے اور بعض دوسرے کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چناں چہ صدر ایوب نے ان کی کوششوں

کی بڑی تعریف کی ہے۔

پشاور یونی ورسٹی میں بچّوں کا ایک ماڈل اسکول ہے، جس میں چار سَو کے قریب بچّے پڑھتے ہیں ۔ اسکول میں اُستانیوں اور بچّوں کی ماؤں کی ایک انجمن بھی ہے۔ اس انجمن نے یہ فیصلہ کیا کہ ہر خاندان کا ایک بچّہ، جو اسکول میں پڑھتا ہے، وہ طبّی امداد کا ایک چھوٹا سَا کپڑے کا تھیلا تیار کرے۔ اس تھیلے پر اپنا اور اپنے اسکول کا نام لکھے، تاکہ پھر یہ سامان زخمی سپاہیوں کو بھیجا جائے۔ اس تھیلے میں یہ چیزیں رکھی گئی ہیں :

۱- زخموں میں استعمال ہونے والی رُوئی کا ایک پیکٹ۔
۲- زخموں میں استعمال ہونے والی گاز کا ایک چھوٹا پیکٹ۔
۳- سَلفا ڈائزین ۱۲ ٹکیاں۔
۴- سوڈامنٹ ۵۰ گولیاں
۵- سُعالین ۶ ٹکیاں
۶- اسپرین نصف پیکٹ
۷- چیونگ گم ۶ عدد
۸- ٹافیاں ایک درجن
۹- کپڑے دھونے کا صابن ایک عدد

بعض بچّوں نے اس میں چند اور چیزیں، جیسے چھوٹے کنگھے، ٹوتھ پیسٹ، ہمدرد منجن اور خشک میوہ وغیرہ بھی شامل کر دیا ہے۔ بہر حال یہ بڑی اچھّی تجویز ہے اور اگر دوسرے شہروں کے اسکولوں میں بھی اسی قسم کے کِٹ تیار کیے جائیں اور زخمی سپاہیوں کو بھیجے جائیں تو بہت اچھا رہے گا۔ اِس طرح ہر بچّے کو یہ احساس ہو جائے گا کہ وہ بھی موجودہ قومی جہاد میں اپنی بساط کے مطابق حصّہ لے رہا ہے۔





بہادر ہواباز

راز یوسفی

پیارے بچو! ابھی پچھلے دنوں
پاکستان اور بھارت کے درمیان جو
زبردست جنگ ہوئی تھی، تمھیں بھولی
نہیں ہوگی اور تم اسے بھول بھی
کیسے سکتے ہو۔ جب کہ تم میں سے
اکثر بچوں نے یہ جنگ اپنی آنکھوں
سے دیکھی ہوگی۔ یا جنگ کی باتیں
اپنے بزرگوں سے سنی ہوں گی اور
تم میں کچھ بچے ایسے بھی ہوں گے
جن کے شہروں کے آس پاس یہ
جنگ لڑی گئی تھی۔

یہ زبردستی کی جنگ تھی، جو
ہمارے ہمسایہ ملک بھارت نے
زبردستی ہم پر ٹھونس دی تھی۔ پاکستان
کے باشندے امن پسند ہیں اور تمام
ہمسایہ ملکوں کے ساتھ دوستی کے
رشتے قائم کرنا چاہتے ہیں، مگر جب
ایک دشمن ہمسایہ نے زبردستی
اپنی فوجوں کو لاہور اور سیالکوٹ
کی سرحد پر لا کھڑا کیا اور چوری
چھپے ہماری سرحدوں کے اندر
داخل ہونا شروع کیا تو ہمیں اپنی
اور اپنے وطن کی حفاظت کے لیے
لڑنا پڑا۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو

ہماری آزادی ختم ہو جاتی، اور ہم دشمنوں کے غلام بن کر رہ جاتے اور تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ غلامی کی زندگی سے موت بھلی ہوتی ہے۔

یہ بڑی خوف ناک جنگ تھی۔ جو پورے پاکستان کے باشندوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر لڑی۔ یہ جنگ زمین پر بھی لڑی گئی۔ ہوا میں بھی اور سمندر میں بھی۔ ایک طرف شہروں میں رہنے والے دشمن کے ہوائی حملوں کا مقابلہ کر رہے تھے اور دوسری طرف سرحدی دیہاتوں میں رہنے والے دیہاتی ہاتھوں میں بندوقیں تھامے ہوئے دشمن کی بزدل فوجوں کو مار بھگانے میں مصروف تھے۔ دشمن کی طاقت ہم سے بہت زیادہ تھی، مگر ہم نے اتفاق کی برکت سے کام لے کر دشمن کی فوجوں کے دانت کھٹے کر دیے۔

اس جنگ میں یوں تو ہماری زمینی فوجوں اور سمندری بیڑے نے بھی بہادری کے بڑے بڑے کارنامے دکھائے، لیکن ہوائی فوج کے لڑاکا ہوا بازوں نے تو سب پیچھے چھوڑ دیا اور سترہ روز کی چھوٹی سی جنگ میں جانبازی اور قربانی کی ایسی مثالیں پیش کی ہیں کہ ساری دنیا عش عش کر اٹھی۔ ایک انگریز نامہ نگار نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ دوسری جنگ عظیم میں برطانوی ہوا بازوں نے اپنی قوم کو جرمن ہوا بازوں کے تابڑ توڑ ہوائی حملوں سے بچانے کے لیے جو جدوجہد کی تھی، پاکستانی ہوابازوں نے ان کی یاد بھی بھلادی۔ اس نامہ نگار نے ان جیالے اور بہادر ہوابازوں کے کارناموں کو سراہتے ہوئے لکھا ہے کہ "جس قوم میں ایسے جری، نڈر اور بہادر نوجوان ہوں، اس قوم کو دنیا کی کوئی طاقت جنگ میں نہیں ہرا سکتی۔"

پاکستانی ہوائی فوج کے لڑاکا ہوا بازوں نے کیسی کیسی قربانیاں دے کر اپنے پیارے وطن کو دشمن کے ناپاک ارادوں سے بچایا ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال نیچے درج کی جاتی ہے، جو اپنی جگہ سچی بھی ہے اور سبق آموز بھی۔

چار پاکستانی ہوا باز اپنے اپنے لڑاکا ہوائی جہازوں میں بیٹھے ہوئے دشمن کے ہوائی اڈے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے دل امنگوں سے بھرپور تھے اور آنکھیں فتح کے نور سے چمک رہی تھیں۔ ہر ہوا باز یہ فیصلہ کر کے اپنے اڈے سے اڑا تھا کہ آج وہ دشمن کے ہوائی اڈے کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دے گا۔ تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ جب دشمن کا ہوائی اڈہ ہی تباہ ہو جائے گا تو پاکستان کی شہری آبادیوں پر بم برسانے والے ہوائی جہاز کہاں سے اڑیں گے؟

چاروں پاکستانی ہوا باز اڑتے اڑتے جب دشمن کے ہوائی اڈے کے قریب پہنچے تو انھیں دشمن کے ہوائی اڈے پر کھڑے ہوئے بے شمار ہوائی جہاز دکھائی دیے۔ چاروں ہوا بازوں کی باچھیں کھل گئیں، اور وہ ایسے خوش ہوئے جیسے کوئی شکاری سامنے کھڑے ہوئے شکار کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

"ٹوٹ پڑو بہادرو! ایک جہاز بھی بچ کر نہ جائے۔" ایک ہواباز نے بڑے جوش کے ساتھ اپنے ساتھیوں کو للکارا۔

"ابھی لو، ہم دشمن کے ہوائی اڈے کا نشان تک نہیں چھوڑیں گے۔" تینوں ہوا بازوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔

چاروں ہوائی جہاز عقابوں کی طرح دشمن کے ہوائی اڈے پر جھپٹے، مگر اس سے پہلے کہ ہوائی جہازوں میں لدے ہوئے بم دشمن کے ہوائی ٹھکانے کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے۔ پیچھے کی طرف سے دشمن کے بچاؤ کرنے والے لڑاکا ہوائی جہازوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے چاروں پاکستانی ہوائی جہازوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور باقاعدہ ہوائی جنگ شروع ہو گئی۔

دشمن کے ہوائی جہازوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ چاروں پاکستانی ہوا بازوں کے لیے اپنا بچاؤ بہت مشکل ہو گیا۔ ایک طرف تو اپنی ناکامی کا غم تھا اور دوسری طرف اپنے بچاؤ کی فکر۔

ایسی صورت میں اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ دشمن کے گھیرے سے نکل کر جان بھی بچالی جائے اور ہوائی جہاز بھی۔ ہر ہوا باز ہوائی جہاز کو اپنی جان سے بھی زیادہ قیمتی سمجھتا ہے، اسی لیے وہ جان دیتے ہوئے بھی جہاز کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی سوچتے ہوئے چاروں ہوابازوں نے دشمن کے گھیرے سے نکلنے کی بھرپور کوشش کی۔ پاکستانی ہوا باز دشمن کے ہوا بازوں سے بہت زیادہ ماہر، پھرتیلے اور چالاک تھے۔ اس لیے وہ بڑی آسانی سے دشمن کا گھیرا توڑنے میں کامیاب ہوگئے۔ کچھ دُور تک دشمن کے ہوا بازوں نے ان کا پیچھا کیا، لیکن اُن کی اڑان اتنی تیز تھی کہ وہ پلک جھپکتے میں دشمن کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئے اور دشمن ہوا باز، پاکستانی جہازوں کے دھوئیں کو بھی نہ پاسکے۔

کافی دُور پہنچ کر ایک پاکستانی ہوا باز کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں اپنے ساتھیوں سے کہا:

"ساتھیو! میں اپنے مقصد کی ناکامی برداشت نہیں کرسکتا۔ دشمن کے گھیرے کو توڑ کر بھاگنا اوّل درجے کی بزدلی ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" ایک ہوا باز نے پوچھا۔

"میں واپس جارہا ہوں۔" اس نے بڑے پکّے ارادے کے ساتھ جواب دیا۔ "کہاں؟"

"دشمن کے ٹھکانے پر۔"

"ابھی جانا سخت غلطی ہوگی۔ دشمن ہوشیار ہے۔ ہماری جانوں کے ساتھ ساتھ ہمارے قیمتی جہاز بھی ضائع ہوجائیں گے۔"

"اگر ہمارے چار جہاز دشمن کے بیس جہازوں کو ٹھکانے لگادیں تو اس سے ہمیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔"

"مگر اس طرح ہم چاروں کو اپنی جانوں سے بھی ہاتھ دھونا ہوگا۔"

"سپاہی کی جان قوم کی امانت ہوتی ہے اور امانت جتنی جلدی مالک کے حوالے کردی جائے

اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔"

ہر طرف سناٹا پھیل گیا۔ کسی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔

اچانک پہلے ہواباز کی آواز تینوں ہوابازوں کے وائرلیس سیٹ پر گونجی:

"اچھا — خدا حافظ، — زندہ رہا، تو پھر ملوں گا۔"

اور پھر ایک ہوائی جہاز تیزی سے مُڑ کر دشمن کے ہوائی اڈے کی طرف لپک رہا تھا۔ تیز — اور تیز، ہوا سے باتیں کرتا ہوا۔

دشمن کے ہوائی جہاز ابھی تک فضا میں چکر کاٹ رہے تھے۔ پاکستانی ہوائی جہاز کو دیکھتے ہی سب چوکنے ہو گئے۔ سائرن کی دہشت ناک آوازیں ہوا میں گونجنے لگیں۔ طیارہ شکن توپوں کے دہانے آگ اگلنے لگے۔ ہوائی اڈے کے عملے میں بھگدڑ مچ گئی۔ قبروں کی طرح کھدی ہوئی خندقوں میں لوگ چھپنے لگے۔ دشمن کے ہوائی جہاز، پاکستانی ہوائی جہاز کو گھیرے میں لینے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگے، مگر جیالا ہواباز جو منصوبہ بنا کر آیا تھا، وہ اسے ہر قیمت پر پورا کرنے پر تلا ہوا تھا۔ وہ جان دینے بھی آیا تھا اور دشمنوں کی جان لینے بھی۔ اور جب کوئی جانباز جان پر کھیلنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے اپنا مقصد پورا کرنے سے نہیں روک سکتی۔

پاکستانی ہواباز پینترے بدلتا ہوا اس مقام تک پہنچ گیا، جہاں دشمن کے بائیس ۲۲ لڑاکا ہوائی جہاز اپنی تباہی کا انتظار کر رہے تھے۔ ان جہازوں پر بم باری کا کوئی موقع نہیں تھا، کیوں کہ دشمن کے لڑاکا ہوائی جہاز پوری طاقت سے پاکستانی ہوائی جہاز پر گولیاں برسا رہے تھے۔ ہواباز اپنی جان سے ہاتھ دھو چکا تھا، لیکن وہ چاہتا تھا کہ جان دینے سے پہلے دشمن کی جان لے لے اور پھر وہ اپنے مقصد میں کام یاب ہو گیا۔ اس کے جہاز میں گولیوں کی بوچھاڑ سے آگ لگ چکی تھی، پورا جہاز ایک بھڑکتے ہوئے شعلے میں

تبدیل ہوگیا تھا، لیکن ابھی تک پاکستانی ہوا باز کے حواس ٹھیک تھے اور وہ پوری تیزی سے اپنے جہاز کو ان ہوائی جہازوں کی طرف لے جا رہا تھا جہاں دشمن کے جہاز تھے اور جن کی مدد سے پاکستانی ٹھکانوں کو نقصان پہنچایا جا سکتا تھا۔

پھر اچانک فضا میں ایک ہولناک دھماکا ہوا اور دشمن کے بائیس جہاز شعلوں کی لپیٹ میں آگئے۔ ہر طرف چیخ پکار سنائی دینے لگی۔ دھماکے ہونے لگے۔ تھوڑی سی دیر میں دشمن کا ہوائی ٹھکانہ ملبے کا ڈھیر بن کر رہ گیا اور پاکستان کی مقدس سرزمین کے دشمنوں کی لاشیں چیلوں اور گدھوں کی خوراک بن کر رہ گئیں۔

وہ جاں باز ہوا باز آج ہم میں موجود نہیں ہے، لیکن اس کا یہ کارنامہ ساری دنیا کو رہتی دنیا تک یاد رہے گا اور جب کوئی تاریخ لکھنے والا پاکستان اور بھارت کی جنگ کی تاریخ لکھے گا تو اس بہادر اور جیالے ہوا باز کا نام سنہرے حروف سے لکھے گا۔

انگریز نامہ نگار ٹھیک ہی تو لکھتا ہے:

"جس قوم میں ایسے جری، نڈر اور بہادر نوجوان ہوں، اس قوم کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں ہرا سکتی۔"

• کم زور پر ظلم کرنے کا نام بہادری نہیں ہے۔ چھوٹوں پر ہاتھ اٹھانے والا بھی بہادر نہیں کہلاتا۔ بہادر وہ ہے جو ظلم نہ کرے، بلکہ صبر و ضبط سے کام لے اور کم زور کی حمایت اور مدد کرے۔

• ہم سایوں سے اچھے تعلقات شرافت کی نشانی ہے اور ہم سایوں سے لڑائی شروع کرنا بہت بڑی برائی ہے۔

• جو تمھارا دوست ہو اور تمھاری بھلائی چاہے تم بھی اس کی دوستی کا حق ادا کرو اور اس کو دھوکا نہ دو۔ دوست بن کر دھوکا دینا بہت بڑا گناہ ہے۔

• اچھے انسان امن سے رہتے ہیں اور امن سے رہنے والوں کی قدر کرتے ہیں۔ وہ لڑائی جھگڑا پسند نہیں کرتے۔

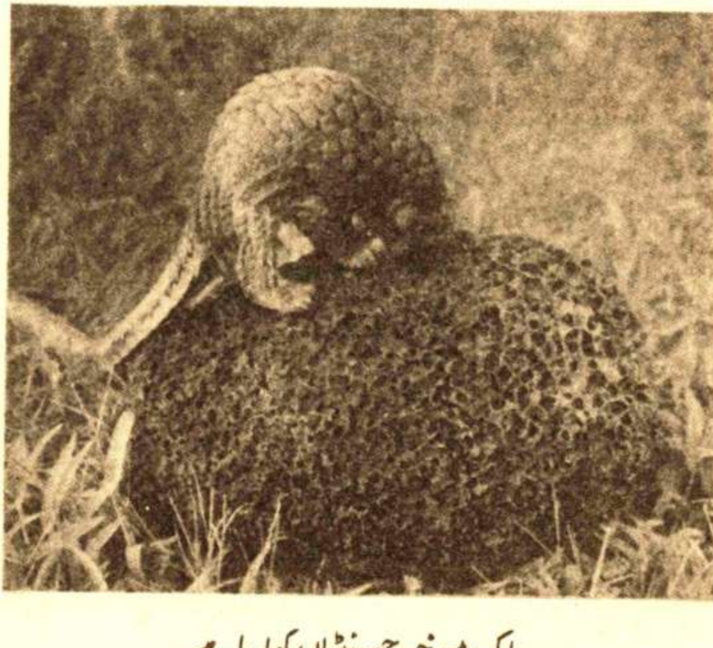
سُرخ ھرن

جو ختم ہو رہے ہیں

اسکاٹ لینڈ کے پہاڑی علاقوں میں سُرخ رنگ کا ایک نایاب ہرن پایا جاتا تھا، جس کی نسل آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اس لیے وہاں کی حکومت نے ایک کمیشن مقرّر کیا، جس کا کام سُرخ ہرنوں کے گلّوں کو بچانے، ان پر کنٹرول رکھنے اور ان کے متعلق تازہ ترین معلومات حاصل کرنے کے سلسلے میں ضروری کارروائی کرنا ہے۔ کمیشن کے آدمی شکاری ٹرکوں میں سوار ہو کر پہاڑی راستوں پر گھومتے رہتے ہیں۔ ان کے پاس آپس میں بات چیت کے لیے ریڈیو ہوتے ہیں۔ وہ طاقتور دُوربینوں سے ہرنوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ ان کے پاس بارہ بارہ فیٹ لمبے بانسوں میں لگے ہوئے جال بھی ہوتے ہیں۔ ان کا کام بڑا صبر آزما ہے۔ طویل انتظار اور محنت کے بعد وہ اپنے کام میں کام یاب ہوتے ہیں۔ پہلے وہ ہرنیوں کو ڈھونڈتے ہیں اور اس وقت تک ان کی نگرانی کرتے رہتے ہیں جب تک بچّہ پیدا نہ ہو جائے۔ پھر اگر وہ ہرنی بچّے کو اس حالت میں جب وہ خود چل نہیں سکتا، چھوڑ کر کہیں چلی جائے تو یہ لوگ بچّے کے پاس پہنچ جاتے ہیں اور اس کے دونوں کانوں سے رنگین پلاسٹک کے ٹکڑے باندھ دیتے ہیں جن پر کچھ اعداد لکھے ہوتے ہیں۔ یہ ٹکڑے دُوربین کی مدد سے ایک ہزار گز کے فاصلے سے پڑھے جا سکتے ہیں۔ اگر ہرن کا بچّہ چلنے کے قابل ہو اور آسانی سے ہاتھ نہ آئے تو اُسے جال کی مدد سے پکڑتے ہیں۔ اس طرح یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ اسکاٹ لینڈ کے علاقہ نارتھ راس شائر میں یہ ہرن کہاں کہاں ملتے ہیں، کیسی جگہ رہنا پسند کرتے ہیں اور کتنے عرصے زندہ رہتے ہیں۔ اندازہ ہے کہ اسکاٹ لینڈ میں ایک لاکھ اسّی ہزار سُرخ ہرن ہیں۔ اس نسل کی ہرنی اس جنگل سے جہاں وہ پیدا ہوتی ہو، زیادہ دور جانا پسند نہیں کرتی، لیکن ہرن سیلانی طبیعت کے ہوتے

ہیں اور دور دور نکل جاتے ہیں۔ اب تک دو سو کے قریب ہرن کے بچوں کے یہ نشانات لگائے جا چکے ہیں۔

کمیشن کا کہنا ہے کہ شکار کیے جانے والے یا کسی اور وجہ سے مرنے والے ہرنوں کے کانوں سے اتارے جانے والے نشانات سے بہت مفید معلومات حاصل ہوں گی۔ مزید برآں اگر یہ نشانات دُوربین کی مدد سے زندہ ہرنوں کے کانوں پر پڑھے گئے تو بھی یہ پتہ چل سکے گا کہ ایک خاص عرصے میں ہرن کن کن تبدیلیوں سے گزرا ہے۔ ان معلومات کی مدد سے ان ہرنوں کی نسل کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کرنے کا بندوبست کیا جا سکے گا۔



ایک مورخور چیونٹیاں کھا رہا ہے۔

تین بہادر بھائی، جو زندہ مگرمچھ پکڑتے ہیں

مناظر صدیقی

ڈگڈگی بجاتا محلّے میں جب بھالو (ریچھ) والا آتا ہے اور تمام بچّے اس کے چاروں طرف جمع ہو کر بھالو کا تماشہ دیکھنے لگتے ہیں تو اسی وقت کوئی بڑا بوڑھا کسی بچّے کو ڈانٹ کر کہتا ہے:

"ریچھ سے دور رہو، یہ کاٹ لیتا ہے۔"

اور بچے فوراً دو دو قدم پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ تم سب کے دل میں اس وقت یہ خیال ضرور آتا ہو گا کہ بھالو والے نے اتنے بڑے اور خوف ناک جانور کو کیسے پکڑا ہو گا؟ پھر بھی ایک بات سوچتے سوچتے تم لوگ گھر جا کر اپنی امّی یا ابّو سے



مگرمچھ کو دیکھ کر بابی اس کی بیٹھ پر چھلانگ لگا رہا ہے

پوچھتے ہوگے کہ بھالو والا بھالو کیسے پکڑتا ہے؟ تو ابو میاں تمھیں بتاتے ہیں کہ بھالو والا جنگلوں میں ایسی جگہ چھُپ جاتا ہے، جہاں بھالو کا بھٹ قریب ہو، پھر جب کوئی چھوٹا سا بچّہ اپنے بھٹ سے نکل کر باہر آجاتا ہے تو وہ چوری چوری اُس بچّے کو پکڑ لیتا ہے۔ اس وقت بچّے میں اتنی تمیز نہیں ہوتی کہ وہ اپنے دوست اور دشمن کو پہچان سکے، اِس لیے بھالو کا بچّہ ان پر حملہ نہیں کرتا۔ پھر بھالو والا اس بچّے کو اپنے ساتھ لاکر ناچنے اور طرح طرح کے کرتب دکھانے کی تربیت دیتا ہے۔

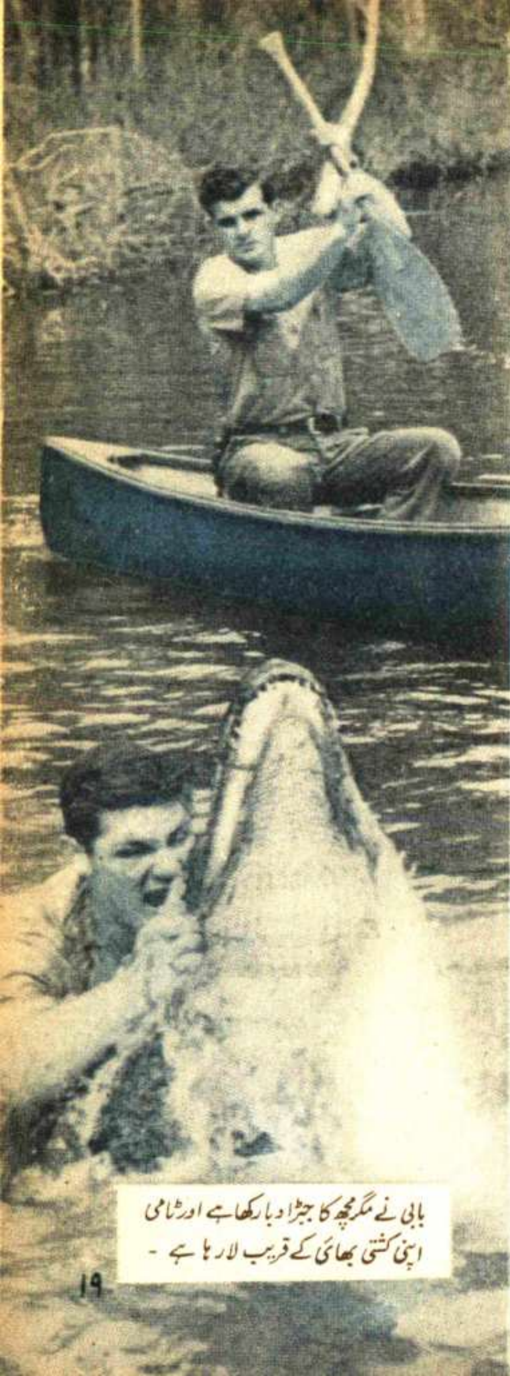
بھالو پکڑنے کے متعلق بتاتے وقت جب تمھیں تمھارے ابو دوسرے خوں خوار جانوروں کو پکڑنے کی کہانی سُناتے ہیں تو تمھیں بڑی حیرت ہوتی ہے۔ ان میں زیادہ تر جانور خشکی کے ہوتے ہیں، جیسے شیر، ہاتھی وغیرہ، جنھیں سرکس وغیرہ میں تم نے بہت سے کھیل دکھاتے ہوئے ضرور دیکھا ہوگا۔

ان تمام جانوروں کو پکڑنے کا عام طریقہ یہی ہے کہ لوگ انھیں اس وقت پکڑتے ہیں جب یہ جانور بہت چھوٹے ہوتے ہیں، پھر یہ کہ خشکی پر کسی بڑے سے بڑے خوف ناک جانور کو پکڑنا اِتنا مشکل کام نہیں، جتنا کِسی دریائی جانور کو پکڑنا مشکل ہے۔

خشکی پر تو انسان اپنے چھُپنے اور جنگلی جانوروں سے بچنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کرسکتا ہے، لیکن پانی میں انسان کے پاس بچنے کا صرف ایک طریقہ ہوتا ہے کہ وہ کشتی میں بیٹھ کر اپنی جان بچالے۔ یہ طریقہ بھی ہمیشہ کار آمد ثابت نہیں ہوتا، اس لیے کہ کبھی کبھی دریائی جانور کشتیاں اُلٹ بھی دیتے ہیں۔ دریا میں تو صرف آدمی کی پھُرتی، چالاکی اور ہمّت ہی کام آتی ہے۔

دریائی جانوروں کا نام آتے ہی تمھارے ذہن میں فوراً مچھلیوں کا خیال آیا ہوگا اور تم سوچ رہے ہوگے کہ مچھلیاں پکڑنا ایسا کون سا مشکل کام ہے، لیکن مچھلیوں کے علاوہ دریاؤں میں اور بھی تو بہت سے جانور ہوتے ہیں۔

ہمارے ملک میں تو مچھلیوں کے علاوہ دریا میں صرف مگرمچھ، گھڑیال، کچھوے وغیرہ ہی پائے جاتے ہیں،



بابی نے مگرمچھ کا جبڑا دبا رکھا ہے اور ٹامی اپنی کشتی بھائی کے قریب لا رہا ہے -

جن میں مگرمچھ سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے اور اس کے بعد گھڑیال کا نمبر آتا ہے۔ یہ دونوں جانور بڑے خوف ناک ہیں۔ دونوں جانوروں کی نسل ایک ہی ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ مگرمچھ کا منھ چوڑا اور شکل بالکل چھپکلی جیسی ہوتی ہے اور گھڑیال کا منھ لمبوترا ہوتا ہے۔ یہ دونوں جانور دریاؤں میں چھوٹی مچھلیاں وغیرہ کھا جاتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی آدمی دریا میں تیر رہا ہو یا کوئی عورت نہا رہی ہو تو یہ اُسے بھی اپنی غذا بنا لیتے ہیں۔ مگرمچھ کی کھال بہت قیمتی ہوتی ہے۔ اس کی کھال کے جوتے، سوٹ کیس اور بیگ وغیرہ بنتے ہیں، جو بہت ہی مہنگے بکتے ہیں۔ امریکا میں مگرمچھ کا شوربہ بھی بڑے شوق سے پیا جاتا ہے۔

مگرمچھ کو عام طور پر لوگ گولی مار کر شکار کرتے ہیں۔ یہ جانور زندہ نہیں پکڑا جاتا۔ صرف ملایشیا ایک ایسا ملک ہے، جہاں بندوق کے بغیر مگرمچھ کا شکار کیا جاتا ہے، لیکن وہاں کے شکاری بھی مگرمچھ کو زندہ نہیں پکڑتے۔ دنیا بھر



بابی اور ٹامی مگرمچھ کو کشتی میں ڈال رہے ہیں

میں صرف تین بھائی ایسے ہیں، جو مگرمچھ کو زندہ پکڑتے ہیں۔ یہ تینوں بھائی امریکہ کی ریاست فلوریڈا میں رہنے والے ایک شخص راس ایلن کے لڑکے ہیں۔

بڑے بھائی کا نام بابی ایلن ہے۔ اس کی عمر ۲۲ سال ہے۔ منجھلے بھائی کا نام ٹامی ایلن ہے۔ اس کی عمر ۱۹ سال اور سب سے چھوٹا بھائی جانی ایلن ہے، جس کی عمر ۱۸ سال ہے۔ یہ تینوں بھائی زندہ مگرمچھ پکڑتے ہیں اور ان کا باپ راس ایلن مگرمچھوں کا شوربہ تیار کرنے کا ماہر ہے۔ دراصل راس ایلن نے فلوریڈا میں سلور اسپرنگ کے مقام پر، ایک ادارہ قائم کر رکھا ہے، جس میں ایسے ہی خوف ناک گزندوں سے لڑنے کی تربیت دی جاتی ہے۔

راس کے تینوں بیٹوں نے اسی ادارے سے اپنے باپ کی نگرانی میں مگرمچھوں کا مقابلہ کرنے کی تربیت حاصل کی ہے۔ تربیت حاصل کیے بغیر یہ لوگ بھلا اس قابل کیسے ہوتے کہ مگرمچھ جیسے خوں خوار جانوروں کو زندہ پکڑ لیں، کیوں کہ مگرمچھ کے خوف ناک لمبے لمبے نکیلے دانت، سخت اور مضبوط دُم اس کے قدرتی ہتھیار ہیں۔

جب مگرمچھ غصّے میں اپنی دُم پانی میں زور سے مارتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے بھونچال آگیا ہو۔ چھوٹی موٹی کشتیاں تو بڑی آسانی سے اُلٹ جاتی ہیں۔ ایسی حالت میں تمھیں تعجب ہو رہا ہوگا کہ یہ تینوں بھائی مگرمچھ کو کیسے پکڑ لیتے ہیں۔

ایلن کے تینوں بیٹوں نے یہ

طریقہ اِختیار کیا ہے کہ وہ ایک چھوٹی سی کشتی میں بیٹھ کر دریا میں اس مقام تک جاتے ہیں، جہاں مگرمچھ بہت زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں، پھر جب انھیں کوئی مگرمچھ نظر آجاتا ہے تو سب سے بڑا بھائی بابی اچانک پیچھے سے مگرمچھ کی پیٹھ پر چھلانگ لگا کر حیرت ناک پھرتی سے اس کا جبڑا پکڑ لیتا ہے اور پیٹھ پر سوار ہو جاتا ہے۔ بابی جبڑا اس طرح پکڑتا ہے کہ مگرمچھ منھ نہ کھول سکے، پھر اس وقت تک یہ جبڑا پکڑے رکھتا ہے، جب تک کہ دوسرا بھائی ٹامی ایک مضبوط رسّی لے کر اس کے پاس نہ آجائے اور رسّی کا پھندا بنا کر مگرمچھ کا منھ نہ باندھا جائے۔

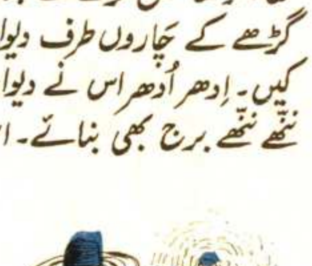
جب اس خوں خوار جانور کا منھ باندھ دیا جائے تو اس کے بعد دونوں بھائی مل کر مگرمچھ کو کشتی میں ڈال دیتے ہیں اور اپنے باپ کے پاس لے آتے ہیں، جہاں راس ایلن یہ فیصلہ کرتا ہے کہ یہ مگرمچھ پالا جائے یا بیچ دیا جائے، جس کسی مگرمچھ کو کاٹ کر اُس کی کھال بیچی جاتی ہے، اس سے ان باپ بیٹوں کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔ ایک فٹ مُربع کھال کا ٹکڑا ایک پاؤنڈ یعنی تقریباً تیرہ رُپے میں فروخت ہوتا ہے۔ یہ لوگ عام طور پر ۶ فیٹ سے زیادہ لمبے مگرمچھ پکڑتے ہیں۔

بہت سے لوگوں نے اُن کی نقل میں مگرمچھ پکڑنے کی کوشش کی، لیکن ہمیشہ ناکام رہے اور اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے، لیکن ان تینوں کو کبھی کوئی نقصان نہ پہنچا۔ شاید اِسی وجہ سے یہ تین بہادر بھائی بہت مشہور ہوگئے۔

جل پری کا تحفہ

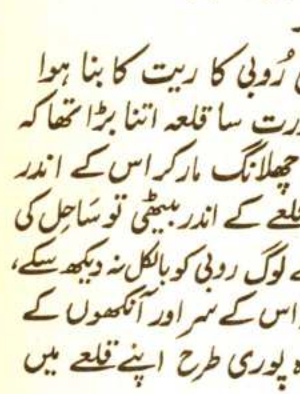


اتوار کا دن تھا۔ صبح کو ناشتے سے فارغ ہو کر رُوبی اور دُوسرے بچوں کو لے کر اس کے والدین سیر کے لیے گئے۔ سمندر کے کنارے پہنچتے ہی ریت دیکھ کر ننھی رُوبی کا دل بے اختیار ریت سے کھیلنے کے لیے مچل گیا اور وہ ایک طرف جا کر ریت سے قلعہ بنانے لگی۔ وہ صبح سے ہی قلعہ بنانے میں مشغول تھی۔ جب وہ مکمل کر چکی تو بڑا ہی پیارا اور خوب صورت قلعہ تیار ہو گیا۔ وہ ایک طرف کھڑی ہو کر تعریفی نظروں سے اپنے بنائے ہوئے ننھے قلعے کی طرف دیکھنے لگی۔ پہلے اس نے ایک گول گڑھا کھودا۔ یہ برابر کا گہرا اور چوڑا تھا۔ گڑھا مکمل کرنے کے بعد اس نے گڑھے کے چاروں طرف دیواریں کھڑی کیں۔ اِدھر اُدھر اس نے دیواروں پر ننھے ننھے برج بھی بنائے۔ اس نے برج بنانے کی آسان ترکیب



یہ سوچی کہ گیلے ریت کے برج کھڑے کر کے ان کے کناروں کو ٹین کی بالٹی کے پیندے سے دبا دیے۔ اس نے باہر کی دیوار پر ایک روشن دان بھی بنایا اور کئی پُل دیدبان کے ساتھ ساتھ بنا دیے۔

ننھی رُوبی کا ریت کا بنا ہوا خوب صورت سا قلعہ اتنا بڑا تھا کہ جب وہ چھلانگ مار کر اس کے اندر گئی اور قلعے کے اندر بیٹھی تو ساحل کی طرف والے لوگ روبی کو بالکل نہ دیکھ سکے، کیوں کہ اس کے سر اور آنکھوں کے علاوہ وہ پوری طرح اپنے قلعے میں چھُپ گئی۔



وہ قلعے کے اندر ریت پر لیٹ کر دھوپ میں آرام کرنے لگی۔ وہ سمندر میں رہ کر بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔ روبی جب اپنے ننھے قلعے کو بنا رہی تھی تو سمندر کا مدوجزر ختم ہو گیا تھا

اور دور دور تک شفاف نرم ریت بچھی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ چوں کہ سمندر پُرسکون تھا اور لہریں سمندر کے کنارے ریت پر نہیں آرہی تھیں، اس لیے رُوبی نے نہایت آرام سے قلعہ بنایا۔ دُور افق پر چمکیلے اور نیلے پانی کا حلقہ دکھائی دے رہا تھا۔ اب سمندر میں مدّو جزر بہت تیزی سے اٹھ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر رُوبی کے بھائیوں نے اُسے آواز دی، پھر اس کی امّی نے اُسے پکارا لیکن وہ مزے سے اپنے قلعے میں ابھی تک کھیل میں مصروف تھی۔ سمندر کے پانی کی پہلی لہر روبی کے قلعے کے روشن دان سے اندر گھس گئی اور قلعے کے اردگرد ایک ننھا سا سمندر تیرنے لگا۔ روبی نے یہ دیکھ کر سوچا کہ کیا ہی اچھا ہو اگر سمندر کی اور کوئی لہر میرے قلعے کی طرف نہ آئے اور قلعہ، روشن دان اور سوراخوں میں بھرے ہوئے پانی کے ساتھ ایسا ہی رہ جائے۔ چھپاک! سمندر کی دوسری لہر کی آواز سُنائی دی اور پانی ریت کے بنے ہوئے قلعے کی دیوار کو توڑتا ہوا قلعے میں گھس آیا۔ یہ دیکھ کر ننھی رُوبی نے خوف سے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اس نے ایک ننھی منّی سی جل پری کو قلعے کے اندر بیٹھا ہوا دیکھا۔



جل پری کو دیکھ کر ننھی رُوبی بُری طرح خائف ہوگئی اور اچھل پڑی۔ رُوبی کو خوف زدہ پاکر اس ننھی جل پری نے اپنے سر کو جنبش دی، جس کی وجہ سے سورج کی روشنی میں جل پری کے سنہرے بال چمکنے لگے۔ اس نے روبی کی طرف دیکھ کر اپنے ننھے منّے ہاتھ اٹھا دیے ”تم مجھ سے خوف زدہ ہوکر اس طرح نہ بھاگو، زمین کی ننھی پیاری بچّی! میں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔ میں تمھاری طرح سمندری دنیا کی ننھی منّی بچّی ہوں۔“ جل پری نے رُوبی سے کہا۔ جل پری کی آواز بے حد سُریلی اور نرم تھی۔ ننھی روبی کا خوف دور ہوگیا اور وہ بولی، مجھے معاف کردو اچھی جل پری! مَیں اِس لیے خوف زدہ ہوگئی تھی کہ مَیں

نے اس سے پہلے کسی جل پری کو نہیں دیکھا تھا۔ اب ننھی روبی اس کے قریب آگئی اور دونوں باتیں کرنے لگیں۔ جل پری کہنے لگی، "روبی! تمھارا ریت کا قلعہ بہت ہی اچھا اور بہت ہی پیارا پیارا ہے۔ اگر سمندر کا پانی اس قلعے میں آجائے اور یہ پوری طرح پانی میں ڈوب جائے تو کیا میں تمھارے قلعے کو اپنے گھر کی طرح استعمال کرسکتی ہوں؟ میں اِس قلعے کی خوب اچھی طرح دیکھ بھال کروں گی، لیکن اگر سمندری گھوڑے اِدھر آگئے تو شاید وہ اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیں۔ اس وجہ سے میں تمھیں یہ قلعہ واپس لوٹانے کا وعدہ نہیں کرسکتی!"

جل پری کی یہ بات سن کر رُوبی بول پڑی "تم بڑے شوق سے اس میں رہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں"۔ رُوبی نے جل پری کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا، لیکن جب جل پری کی ننھی منّی انگلیوں میں برف کی سی ٹھنڈک محسوس کی تو وہ تھوڑا سا اچھل پڑی۔

جل پری نے ننھی رُوبی کا شکریہ ادا کیا اور کہا، "میں تمھارے قلعے میں بیٹھ کر تمھارا احسان مانوں گی۔ جب سمندر پُرسکون ہو جائے گا تو میں ریت پر تمھارے لیے ایک تحفہ چھوڑ جاؤں گی۔



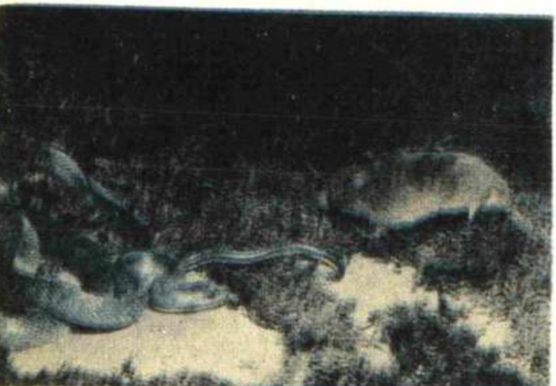
تم کل صبح آکر میری بات کو آزما لینا۔" اتنے میں رُوبی کی امّی کی آواز سُنائی دی، "رُوبی بیٹی! ذرا جلدی کرو۔ ہم جانے کے لیے تیار ہیں۔ کل صبح آکر تم پھر دوسرا قلعہ بنا لینا!" اس کے بعد سمندر کی ایک بڑی سی لہر آئی اور ننھی منّی سی خوب صورت جل پری پانی میں غائب ہوگئی اور روبی بھاگ کر اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ مل کر گھر آگئی۔

تمام رات روبی سو نہ سکی۔ اس کی خواہش تھی کہ بس جلدی سے صبح ہو جائے اور وہ سمندر کے کنارے جاکر دیکھے کہ جل پری اس کے لیے کیا تحفہ چھوڑ گئی ہے۔ آخر اللہ اللہ کرکے صبح ہوئی اور رُوبی نے منھ

ہاتھ دھو کر الٹا سیدھا ناشتہ کیا اور پھر جلدی جلدی قدم بڑھاتی ہوئی سمندر کی طرف گئی۔ سمندر کا طوفان ختم ہوچکا تھا۔ دور تک ریت ہی ریت دکھائی دیتی تھی اور دور افق کے پار پانی کا ایک چمک دار نیلا چکّر نظر آرہا تھا اور سورج بھی سر پر چمک رہا تھا۔ جیسا کہ خوب صورت جل پری نے کہا تھا۔ روبی کا بنایا ہوا ریت کا قلعہ برابر ہوچکا تھا، لیکن اس جگہ، جہاں پر قلعہ تھا، وہاں ایک بڑا سفید اور سنہرے رنگ کا گھونگا پڑا ہوا تھا۔ رُوبی نے گھونگے کو اٹھا لیا اور ہاتھ میں گھمانے لگی۔" جل پری کا خوب صورت تحفہ" وہ گھونگے کو آہستہ سے اٹھا کر اپنے کان کے قریب لے جا کر سننے لگی۔ سنہری گھونگے کے اندر سے جل پری کے گانے کی پیاری اور سُریلی آواز آرہی تھی۔ یہ سمندر کا نہ ختم ہونے والا گیت تھا۔ یہ لہراتی ہوئی موجوں اور نیلے سمندر کا گیت تھا، جس کے اوپر گرمیوں کا تیز سورج چمک رہا تھا اور روبی نے سوچا کہ وہ جل پری کا یہ خوب صورت تحفہ ہمیشہ اپنے پاس رکھے گی، کیوں کہ اسے اپنی محنت اور نیکی کا انعام ملا تھا۔



سانپ کی غذا ـــ چوہے



ایک سانپ چوہے پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہے۔

بین بجاتا محلّے میں سانپ والا آگیا تو سارے بچّے جمع ہوگئے۔ اُن میں منّو بھی تھے اور گڈّو بھی۔ منّو کی سمجھ میں تو کچھ بھی نہ آتا۔ ہر چیز کو لپک کر پکڑنے کی کوشش کرتے۔ گڈّو البتہ سمجھ دار تھی۔ کسی ایسی ویسی چیز کو ہاتھ بھی نہ لگاتی، لیکن تھی بہت ضدی۔ ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتی تو منانا مشکل ہو جاتا اور تو کسی کی بات سنتی ہی نہیں تھی، البتہ باجی شاہدہ سے ذرا اُسے ڈر ہی لگتا تھا۔ بڑھ کر چانٹا جو مار دیتی تھیں۔ وہ تو اس روز خیر ہوئی کہ باجی شاہدہ ابھی اسکول سے نہیں آئی تھیں، اس لیے گڈّو کی بن آئی اور لگی ضد کرنے کہ ہم تو سانپ دیکھیں گے۔ پہلے تو امّی نے بہت سمجھایا کہ کسی طرح بی گڈّو مان جائیں، لیکن جب بی گڈّو کی ضد ختم ہی نہ ہوئی تو مجبوراً سپیرے کو بلا کر ایک مٹھی آٹا اور کچھ پیسے دے کر سانپ دکھانے کو کہا۔

ابھی سپیرا اپنی پٹاریاں کھول ہی رہا تھا کہ باجی شاہدہ اسکول سے واپس پہنچ گئیں اور اُن کے پیچھے پیچھے ابّو میاں بھی آ گئے۔ شاید آج اُنھیں جلدی فرصت ہو گئی تھی۔



سانپ کی غذا — چوہے

سانپ چوہے کے گرد لپٹ کر اُسے دبا کر مار ڈالتا ہے۔

شاہدہ باجی دروازے پر ہی رک گئی تھیں اور وہ بھی سپیرے کی پٹاری میں سے نکلتے ہوئے طرح طرح کے سانپ دیکھ رہی تھیں۔ پٹارے میں سانپ تھے بھی طرح طرح کے۔ کوئی کالا تھا تو کوئی کتھئی رنگ کا۔ کوئی کوڑیالا تھا تو کوئی دُومُوئی۔ باجی شاہدہ نے پہلے تو اپنی بزرگی اور بڑا پن جتانے کے لیے بی گڈو کے ایک چانٹا رسید کیا، کہنے لگیں،

"پیچھے ہٹو نہیں تو سانپ کھا جائے گا۔"

بی گڈو تو شاہدہ باجی کا چانٹا کھا کر منہ بناتی ہوئی پیچھے ہٹ گئیں، لیکن سپیرے نے فوراً شاہدہ باجی کو ٹوک دیا۔

"نہ بی بی یہ سانپ کسی کو نہیں کھاتے۔"

"واہ! نہیں کھاتا تو کیا ہوا، کاٹتا تو ہے۔" شاہدہ باجی تڑ سے بولیں۔

"نہیں بی بی، یہ پلے ہوئے سانپ ہیں، کاٹتے بھی نہیں۔" سپیرا بولا۔

شاہدہ باجی اُس وقت تو چپ ہو رہیں پھر کچھ رُک کر اُنھوں نے سپیرے سے پوچھا،

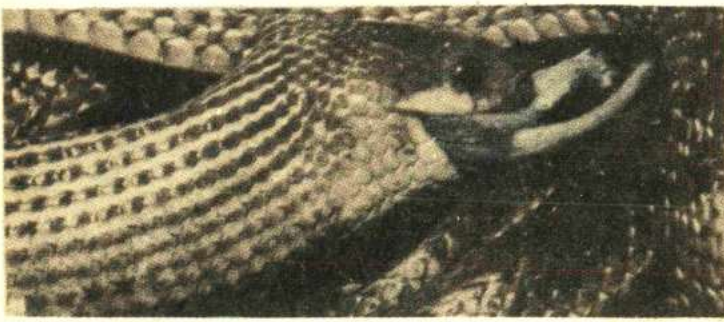
"ارے تم ان سانپوں کو کھلاتے کیا ہو؟"

"دودھ پلاتے ہیں بی بی۔" سپیرے نے کہا۔



چوہے کو سانپ اس کے منھ کی طرف سے نگلتا ہے۔

"تم تو انھیں دودھ پلاتے ہو، کیوں کہ یہ پلے ہوئے ہیں اور جو سانپ پلے ہوئے نہیں ہوتے وہ کیا کھاتے ہیں؟" شاہدہ باجی نے پوچھا۔
ابھی سپیرا کوئی جواب نہ دے پایا تھا کہ ابّو میاں نے کہا،



سانپ چوہے کو نگل چکا ہے، صرف پیر اور دم باقی رہ گئے ہیں۔

"شاہدہ تم اندر چلو ہم تمھیں بتادیں گے سانپ کیا کھاتے ہیں اور کس طرح کھاتے ہیں۔"
پھر سپیرا تو اپنی پٹاریاں بند کر کے چلا گیا اور ابو میاں کے ساتھ شاہدہ اور بی گڈو بڑے کمرے میں آگئیں، پھر ابّو میاں نے کہا،
"اب تم چپ چاپ بیٹھ کر سنو، اگر بیچ میں بولو گی تو ہم کچھ نہیں بتائیں گے۔"
پھر ابّو میاں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا،
"سانپ کو دیکھنا تو الگ بات ہے صرف سانپ کے قصّے سن کر ہی بدن میں کپکپی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ سانپوں کی یوں تو بہت سی قسمیں ہیں، جن میں سے ہمارے ملک میں ناگ اور کوڑیالا سانپ بہت مشہور ہیں، کیوں کہ یہ بہت زہریلے ہوتے ہیں، بعض سانپ بہت بڑے بڑے بھی ہوتے ہیں۔ بڑے سانپوں میں اژگر اور اژدھا سانپ بہت مشہور ہیں۔ ہمارے ملک کے علاوہ اژگر اور اژدھے جنوبی امریکا اور افریقہ میں بڑی کثرت سے ملتے ہیں۔ سانپ یوں تو جنگل میں

چھوٹے چھوٹے جانور اور پرندوں کے بچوں کو گھونسلوں سے نکال کر کھاجاتا ہے، لیکن اس کی سب سے زیادہ پسندیدہ غذا چوہا ہے۔ بعض سانپ تو چوہوں کو بغیر مارے زندہ ہی نگل جاتے ہیں، لیکن بعض اُنھیں کھانے سے پہلے مار ڈالتے ہیں۔ یورپ میں ایک خاص قسم کا سانپ پایا جاتا ہے، جو دوسرے زہریلے سانپوں کے مقابلے میں زیادہ تر اپنی غذا کو کھانے سے پہلے دبا کر مار ڈالتا ہے۔ جب سانپ چوہوں کو پکڑتا ہے تو بڑی عقل مندی سے کام لیتا ہے۔ سانپ کو جب کوئی چوہا نظر آجائے تو بڑی تیزی سے حملہ کر کے اُس کے



پیٹ بھرنے کے بعد سانپ آرام کرتا ہے۔

گرد لپٹ جاتا ہے، تاکہ چوہے کا دم گھٹ جائے۔ چوہے کے بدن پر چوں کہ بال ہوتے ہیں، اس لیے سانپ کے لیے یہ بہت مشکل سی بات ہوتی ہے کہ اُسے آسانی سے نگل جائے۔ چناں چہ چوہے کو نگلنے سے پہلے سانپ چوہے کا منھ تلاش کرتا ہے، پھر اسے منھ کی طرف سے نگلتا ہے۔ بعض چوہے اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ سانپ کی حلق کے پتلے سے سوراخ سے ان کا گزرنا مشکل ہوتا ہے، اس لیے منھ کی طرف سے نگلنے میں سانپ کو بڑی آسانی ہوتی ہے۔ پھر بھی چوہے کو نگلتے وقت سانپ چوہے کو ایک جگہ

رکھ کر اُس کا منھ اپنے منھ میں لیتا ہے، پھر خود کو طاقت لگا کر چوہے کی طرف دھکیلتا ہے۔ سانپ میں اپنی غذا کو ہضم کرنے کی طاقت بہت زیادہ ہوتی ہے، اس کے علاوہ سانپ اپنا منھ کھلنے کے بعد خاصا بڑا ہو جاتا ہے، جس سے چوہے کو نگلنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ چوہے کو نگلنے کے بعد سانپ اتنا تھک جاتا ہے کہ اس کے لیے چلنا پھرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے، اس لیے خود سانپ کو ایسی حالت میں اپنے اوپر حملے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ چوہے کو نگلنے کے بعد سانپ بڑی دیر تک آرام کرتا ہے۔ اُس وقت قدرتی طور پر اس کے پیٹ میں ایسے تیزاب پیدا ہوتے ہیں جن سے چوہا ہضم ہو جاتا ہے۔ سانپ کو جلدی جلدی بھوک نہیں لگتی۔ ایک مرتبہ اگر پیٹ بھر کر غذا مل جائے تو پھر بہت دیر کے بعد اسے غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔

اتنا کہہ کر ابو میاں نے الماری سے ایک کتاب نکال کر شاہدہ باجی اور گڈّو کو سانپ کی کئی تصویریں دکھائیں اور پھر دونوں سے اپنی کتابیں پڑھنے کی ہدایت کر کے چلے گئے۔

ایک دیہاتی : (اپنے دوست سے) میرا لڑکا حساب میں بڑا لائق ہے، خاص طور پر بھیڑیں گننے میں تو کمال ہی کر دیتا ہے۔

دوست : وہ کیسے ؟

دیہاتی : پہلے وہ بھیڑوں کی ٹانگیں گن لیتا ہے اور پھر ان کو چار پر تقسیم کر دیتا ہے۔

افیونی : خیرو ! ذرا ادھر آنا۔ دیکھو یہاں کوئی گرا ہے۔

خیرو : جناب آپ خود چارپائی سے گرے ہوئے ہیں۔

افیونی : اوہو ! تو پھر خوب چوٹ لگی ہوگی۔

بار بار پڑھنے کے قابل



مُرغی اور اس کے بچّے

خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم



شام ہے اور اندھیرے کا وقت — ہے پرندوں کے بسیرے کا وقت
اب ہے پانی کی نہ دانے کی تلاش — جس کو ہے اپنے ٹھکانے کی تلاش
رات بھر جب کہ گزر جائے گی — اور اُجالے کی گھڑی آئے گی
سُنیو تم اُٹھ کے سویرے سے ذرا — یہ جو ہے، گھر میں تمھارے مُرغا
پھڑپھڑاتا ہے پَر و بال کو کیا — جھاڑ دیتا ہے وہ سُستی گویا
اور سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں — چیختا زور سے ہے ککڑوں کوں
دن نکلتے ہی ادھر مرغی بھی — فوج بچّوں کی لیے نکلے گی
تاکہ وہ صبح کا کھائیں کھانا! — رات بھر کے ہیں بے آب و دانہ
چونچ سے دے گی وہ منھ میں اُنکے — جو پڑے پائے گی دانے دُنکے
ٹکڑے روٹی کے ہوں یا ہو، دانہ — ہے غذا اُن کی یہی روزانہ
مینہ برستا ہے تو بچّے سارے — آ دبکتے ہیں، پَروں میں ماں کے
چین سے ان میں چھپے رہتے ہیں — ماں کی چھاتی سے لگے رہتے ہیں
مُرغی جس طرح کہ ان بچّوں کی — کرتی ہے شام و سحر رکھوالی!

بس اسی طرح سمجھ لو کہ خدا
ہے ہماری بھی حفاظت کرتا

مُسلم ضیائی

ایک رُوسی مصنّف — ٹالسٹائے

ناممکن ہے کہ آپ نے لیو ٹالسٹائے کا نام نہ سُنا ہو۔ وہ ایک بہت بڑا مصنّف تھا اور اگرچہ روس میں پیدا ہوا، لیکن اس کی تحریروں میں ہر شخص کو اپنا دل دھڑکتا معلوم ہوتا ہے۔

اس نے کئی ناول اور افسانے لکھے ہیں۔ وہ اپنے زمانے ہی کا نہیں، ہر زمانے کا بڑا اور ممتاز انسان کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ لوگ اس کی زندگی میں اس کی بڑی عزّت کرتے تھے اور آج بھی جب کہ اسے مرے ہوئے پچپن ۵۵ سال گزر چکے ہیں، اس کا نام زندہ ہے۔

اس کا انتقال ۱۹۱۰ء میں ہوا۔ لوگ اس کی اتنی عزّت کرتے تھے کہ اس کے مرنے سے بیس سال پہلے ہی اس کی صورت دیکھنے، اس کی آواز سننے اور صرف اس کے کپڑوں کو اپنے ہاتھوں سے چھُو لینے کے لیے اس کے گھر جاتے اور گھنٹوں اس کے باہر نکلنے کا انتظار کرتے رہتے تھے۔

وہ کوئی پیر یا مُرشد وغیرہ نہیں تھا لیکن اس کی تحریروں اور عمل نے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔

اس کے دوست دور دور سے آکر اس کے گھر میں کئی کئی برس ٹھیرے رہتے اور جو کچھ اس کی زبان سے نکلتا، اسے لکھ لیا کرتے تھے۔ اس کی ان باتوں کو بڑی بڑی کتابوں میں چھپوا لیا گیا ہے۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ ٹالسٹائے کے بارے میں لوگوں نے کتنا لکھا ہے؟ نہیں، آپ اندازہ نہیں کرسکتے۔ اس

کے بارے میں پچیس ہزار سے زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں!
اخباروں اور رسالوں وغیرہ میں کوئی ساٹھ ہزار مضمون چھپے ہیں! اور خود اس کی تحریریں ایک سو جلدوں میں شائع ہوئی ہیں۔
ٹالسٹائے زار روس کے زمانے میں، یعنی انقلابِ روس سے پہلے ایک دولت مند گھرانے میں پیدا ہوا تھا، لیکن زندگی کے آخری زمانے میں اس نے اپنی زمین اور جائداد وغیرہ سب کچھ چھوڑ دیا، کیوں وہ زمین داری اور بہت سی دولت جمع کر لینے کے خلاف تھا۔ اس نے انسانوں کی بھلائی اور ان کی خدمت کو اپنا فرض مقرر کر لیا تھا۔
وہ کہتا تھا کہ قدرت کی نعمتوں سے ہر شخص کو اس کا حق ملنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ساری دولت تقسیم کر دی اور جب اس کی موت ہوئی تو اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ وہ اپنا شان دار محل چھوڑ چکا تھا اور ایک چھوٹے سے گاؤں میں کسانوں کے ساتھ رہتا تھا۔
جوانی میں اس کے بدن پر بڑے شان دار اور قیمتی کپڑے ہوتے تھے۔ وہ بڑی شان سے ان قیمتی کپڑوں کو پہنے اکڑتا پھرتا تھا، لیکن آخری زمانے میں اس نے سب کچھ چھوڑ کر کسانوں کے سے موٹے کپڑے پہننے شروع کر دیے تھے۔ وہ اپنے ہاتھ سے جوتے گانٹھ لیتا، اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتا اور اپنے ہی ہاتھ سے کھانا پکا کر کھاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں اس کی زندگی نہایت سادہ اور نیک زندگی کا بہترین نمونہ تھی۔
عجیب بات یہ ہے کہ ٹالسٹائے طالبِ علمی کی زندگی میں ناکام رہا۔ کالج میں اس کے استاد خیال کرتے تھے کہ اس کے سر میں دماغ ہی نہیں اور عقل سے محروم ہونے کے باعث کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا، لیکن تیس سال بعد اسی ٹالسٹائے نے دو بہترین ناول لکھے، جو کبھی بھلائے نہیں جا سکتے۔ ایک کا نام

ہے "جنگ اور امن" اور دوسرا ہے "اینا کرے نینا"۔ ان دونوں کے ترجمے دنیا کی بہت سی زبانوں میں ہو چکے ہیں اور کوئی شخص ایسا نہیں جو انھیں پڑھ کر متاثر نہ ہو۔

روس میں بڑے بڑے بادشاہ

اس کو دولت سے نفرت تھی۔ وہ اسے تمام برائیوں، خصوصاً ظلم اور ناانصافی کی جڑ سمجھتا تھا، لیکن اس کی بیوی ظلم اور زبردستی کی قائل تھی۔ وہ دولت اور ذاتی جائداد حاصل کرنے کو گناہ سمجھتا تھا، لیکن اس کی



گزرے ہیں۔ انھیں زار کہتے تھے۔ یہ بڑے ظالم اور جابر تھے۔ لوگ ان کی زندگی میں ان سے ڈرتے اور ان کے نام سن کر کانپ اٹھتے تھے، لیکن آج بہت کم لوگ ہیں، جو ان کے نام بھی جانتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ٹالسٹائے کا نام نہ صرف روس، بلکہ ساری دنیا میں بڑی عزّت سے لیا جاتا ہے۔

اس نے انسان کی بھلائی اور دنیا میں امن قائم کرنے کے لیے بہت سی چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھی تھیں، جو چار سال میں ایک کروڑ بیس لاکھ کی تعداد میں دروازے دروازے لے جاکر بیچی گئیں، تاکہ ٹالسٹائے کی تعلیمات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ جائیں۔

ٹالسٹائے نہایت نیک آدمی تھا، مگر اس کی خانگی زندگی بڑی غم گین تھی۔ بیوی کے خیالات اس سے بالکل مختلف تھے۔ وہ اس کے دوستوں سے نفرت کرتی تھی اور کبھی کبھی تو غصّے میں آکر خودکشی کرلینے کی دھمکی دیتی تھی۔ اس کو اس بات کا بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اس کا شوہر ٹالسٹائے دنیا کا کِتنا بڑا آدمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روز روز کے ہنگاموں سے اس نے ٹالسٹائے کو ذہنی اذیتوں میں مبتلا کرکے گھر کو دوزخ کا نمونہ بنا دیا تھا۔

ٹالسٹائے اپنی بیوی کی ان تمام باتوں کو برداشت کرتا رہا، لیکن کب تک۔ بعض اوقات وہ بہت پریشان ہو جاتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس مصیبت سے کیوں کر چھٹکارا حاصل کرے۔ وہ طلاق دینا نہ چاہتا تھا، اس لیے عرصے تک ان تکلیفوں اور اذیتوں کے درمیان جس طرح بھی بن سکا، گزارا کرتا رہا، لیکن ایک روز اس قدر پریشان ہوا کہ جھگڑے کے بعد ۱۲ اکتوبر ۱۸۱۰ء کو رات میں جب اس کی عمر بیاسی سال تھی، گھر سے بھاگ کر ایک گاؤں میں پناہ لی۔ اس کے گیارہ روز بعد نمونیے سے اس کا انتقال ہوگیا۔ مرتے وقت اس کی زبان پر یہ الفاظ تھے:

"تلاش کرو۔ تلاش کرو۔ ہمیشہ تلاش کرتے رہو۔"

بار بار پڑھنے کے قابل

مسز چڑیا کی کہانی

ہمارے بزرگوں نے بہت سی چیزیں ایسی لکھی تھیں، جو ایک زمانہ گزرنے کے بعد اب بھی پڑھنے اور فائدہ اٹھانے کے قابل ہیں۔

خواجہ حسن نظامی مرحوم

ایک چڑے چڑیا نے نئی روشنی کی ایک اونچی کوٹھی میں اپنا گھونسلا بنایا تھا۔ اس کوٹھی میں جو صاحب رہتے تھے، وہ ولایت سے بیرسٹری پاس کرکے ایک میم کو ساتھ لے کر آئے تھے۔ اُن کی بیرسٹری کچھ چلتی نہ تھی، مگر گھر کے امیر زمین دار تھے۔ گزارہ خوبی سے ہو جاتا۔ ولایت سے آنے کے بعد خدا نے ان کو ایک لڑکی بھی عنایت کی، جو ماشاءَاللہ خوب صورت تھی۔ باپ کی طرف سے مسلمان اور ماں کی طرف سے مِس بابا تھی۔ چڑے چڑیا نے کھپریل کے ایک سوراخ میں گھونسلا بنایا۔ تنکوں اور سُوت کا فرش بچھایا۔ یہ سُوت پڑوس کے ایک گھر سے چڑیا لائی تھی۔ وہ بے چاری چرخا کاتا کرتی تھی۔ الجھا ہُوا سُوت پھینک دیتی تو چڑیا اٹھا لاتی اور اپنے گھونسلے میں بچھا دیتی۔ خدا کی قدرت ایک دن انڈا پھسل کر گر پڑا اور ٹوٹ گیا۔ ایک ہی باقی رہا۔ چڑے چڑیا کو اس انڈے کا بڑا صدمہ ہوا۔ جس دن انڈا گرا تو چڑیا گھونسلے میں تھی۔ چڑا باہر دانہ چگنے گیا ہوا تھا۔ وہ گھر میں آیا تو چڑیا کو چُپ اور رنجیدہ دیکھ کر سمجھا میرے دیر میں آنے سے خفا ہوگئی ہے۔ لگا پُھدک پُھدک کر چوں چوں چیں چڑ چوں چڑ چوں کرنے۔ کبھی چونچ مار کر گدگدی کرتا، کبھی خود اپنے پَروں کو پھلاتا، ناچتا، مٹکتا اور چڑیا کی چونچ پر اپنی چونچ محبت سے رکھتا، مگر چڑیا اسی طرح پھُولی اُبھری خاموش بیٹھی رہی۔

اس نے مَرد ذات کی خوشامد کا کچھ بھی جواب نہ دیا۔ چڑا سمجھا بہت ہی ناراض ہے۔ مزاج حد سے زیادہ بگڑ گیا ہے۔ خوشامد سے کام نہ چلے گا۔ مجھ مرد کی کتنی بڑی توہین ہے کہ اتنی دیر خوشامد درآمد کی، بیگم صاحب نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ یہ خیال کر کے چڑا بھی منھ پھیر کے بیٹھ گیا اور چڑیا سے منھ پھیر کر نیچے بیرسٹر صاحب کو جھانکنے لگا، جو اپنی میم صاحب کے سامنے آرام کرسی پر پاؤں پھیلائے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ چڑے نے خیال کیا کہ یہ آدمی کیسے خوش نصیب ہیں۔ دونوں کیسے ہنسی خوشی اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ ایک میں بد نصیب ہوں، سویرے کا گیا گیا دانہ چگ کر اب گھر میں گھسا ہوں، مگر چڑیا صاحبہ کا مزاج ٹھکانے نہیں ہے۔ کاش میں چڑا نہ ہوتا اور کم سے کم آدمی بنایا جاتا۔

چڑا اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ چڑیا نے ایک غم ناک آواز نکالی۔ چڑے نے جلدی سے اُڑ کر چڑیا کو دیکھا اور کہا، "چوں چوں چڑ چوں چوں، کیا ہو، آج تم ایسی چپ چاپ کیوں ہو؟" چڑیا بولی، "انڈا اگر کے ٹوٹ گیا۔" انڈے کی خبر سے پہلے تو چڑے کو بہت رنج ہوا، مگر اس نے صدمے کو دبا کر کہا، "تم کہاں چلی گئی تھیں۔ انڈا کیوں گر پڑا؟" چڑیا نے کہا "میں اڑ کر ذرا چمن کی ہَوا کھانے چلی گئی تھی۔ جھپٹے کے صدمے سے انڈا پھسل گیا۔" یہ بیان سُن کر چڑا آپے سے باہر ہو گیا۔ اس کے مَردانہ جوش میں طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کڑک دار گرجتی ہوئی چوں چوں میں کہا، "پھوہڑ، بدسلیقہ، بے تمیز تو کیوں اُڑی تھی۔ تجھ کو چمن کی ہَوا کے بغیر کیا ہُوا جاتا تھا۔ کیا تو بھی اس گوری عورت کی خصلت سیکھتی ہے، جو گھر کا کام نوکروں پر چھوڑ کر ہوا خوری کرتی پھرتی ہے، تُو ایک چڑیا ہے۔ تیرا کوئی حق نہیں کہ بغیر میری مرضی کے باہر نکلے۔ تجھ کو میرے ساتھ اڑنے اور ہوا خوری کرنے کا حق ہے۔ آج کل تو انڈوں کی نوکر تھی۔ تجھے یہاں سے ہٹنے کا اختیار نہ تھا۔ تو نے میرے ایک انڈے کا نقصان

کرکے اتنا بڑا قصور کیا ہے کہ اس کا بدلہ کچھ نہیں ہوسکتا۔ تونے میرے بچے کو جان بوجھ کر مار ڈالا۔ تونے خدا کی امانت کی قدر نہ کی، جو اس نے ہم کو نسل بڑھانے کی خاطر دی تھی۔ میں تو پہلے ہی منع کرتا تھا کہ اری کم بخت، اس کوٹھی میں گھونسلا نہ بنا۔ ایسا نہ ہو ان لوگوں کا اثر ہم پر بھی پڑ جائے۔ ہم بے چارے پرانے زمانے کے دیسی چڑے ہیں۔ خدا ہم کو نئے زمانے کے چڑے چڑیا سے بھی بچائے رکھے، کیوں کہ پھر گھر کے رہتے ہیں نہ گھاٹ کے، مگر تو نہ مانی اور "کوٹھی ہی میں رہوں گی"، "کوٹھی ہی میں گھر بناؤں گی"؛ یہ کہہ کہہ کر میرا ناک میں دم کر دیا۔ اب لا میرا بچہ، میں تجھ سے لوں گا۔ نہیں تو مارے ٹھونگوں کے کچلا بنا دوں گا۔ بڑی میم صاحب نکلی تھیں ہوا کھانے۔ اب بتاؤں تجھ کو ہوا کھانے کا مزا۔" چڑیا پہلے تو اپنے غم میں چپ چاپ چڑے کی باتیں سنتی رہی، لیکن جب چڑا حد سے بڑھا تو اس نے زبان کھولی اور کہا، "بس بس، سن لیا۔ بگڑ چکے۔ زبان کو روکو۔ انڈے بچے پالنے کا مجھ ہی پر ٹھیکا نہیں ہے، تم بھی برابر کے شریک ہو۔ سویرے کے گئے گئے یہ وقت آگیا۔ دوپہر میں گھر کے اندر گھسے ہیں اور آئے تو مزاج دکھاتے آئے۔ انڈا گر پڑا میرے پنجے کی نوک سے۔ میں کیا کروں۔ میں کیا انڈوں کی خاطر اپنی جوان جان کو گھن لگا لوں۔ دو گھڑی باہر کی ہوا بھی نہ کھاؤں۔ صبح سے یہ وقت آیا کہ دانہ حلق سے نیچے نہیں گیا۔ تم نے پھوٹے منہ سے یہ نہ پوچھا کہ تو نے کچھ تھوڑا بہت نگلا یا مزاج ہی دکھانا آتا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ اکیلی چڑیا پر سب بوجھ تھا۔ اب آزادی اور برابری کا وقت ہے۔ آدھا کام تم کرو، آدھا میں کروں۔ دیکھتے نہیں میم صاحب کو، وہ تو کچھ بھی کام نہیں کرتیں، صاحب کو سارا کام کرنا پڑتا ہے اور بچے کو آیا کھلاتی ہے۔ تم نے ایک آیا رکھی ہوتی۔ میں تمھارے انڈے بچوں کی آیا نہیں ہوں۔"

چڑیا کی اس تقریر سے چڑا سن ہوگیا اور کچھ جواب نہ بن پڑا۔ بے چارہ غصے کو پی کر پھر خوشامد کرنے لگا اور

اس دن سے چڑیا کے ساتھ انڈے کی آدھی دیکھ بھال اپنے ذمّے لے لی۔

مس چڑیا کی پیدائش

ایک انڈا تو ٹوٹ چکا تھا، دوسرے انڈے سے ایک بچّہ نکلا، جو مادہ یعنی چڑیا تھی۔ جب یہ بچّہ ذرا بڑا ہوا اور اس نے میم صاحبہ کے بچّے کو دیکھا کہ وہ کاٹھ کے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے، گھڑی گھڑی دودھ پیتا ہے، ٹب میں بیٹھ کر نہاتا ہے۔ نئے خوب صورت کپڑے پہنتا ہے تو اس چڑیا زادی نے بھی باپ سے کہا، "چیں چیں چیں، ابا، مجھ کو بھی گھوڑا منگا دو۔ ابا، میں بھی ٹب میں نہاؤں گی۔ ابا، مجھ کو رنگ بہ رنگ کے کپڑے لا کر دو۔" چڑے نے چڑیا سے کہا، "لے سُن، دیکھا مزا کوٹھی میں گھر بنانے کا؟ اب لا اپنی لاڈلی کے واسطے گھوڑا، ٹب منگا، کپڑے بنا۔" چڑیا نے کہا، "دیکھو پھر وہی لڑائی کی باتیں نکالیں۔ ایک کی تو تمھاری اس کِل کِل سے جان گئی۔ یہ نگوڑی بچّی ہے، تم اس کو بھی نہیں دیکھ سکتے۔ بچّہ ہے، کہنے دو، یہ کیا جانے، ہم غریب ہیں اور یہ چیزیں نہیں لا سکتے۔ بڑی ہوگی تو آپ سمجھ لے گی کہ چڑیوں کو آدمی کی ریس سے کیا سروکار۔"

مس چڑیا نے ماں کی بات سُن کر کہا، "واہ بی اماں واہ! تم غریب تھیں تو اس امیر کی کوٹھی میں آ کر کیوں رہی تھیں۔ گاؤں کے چھپر میں گھر بنایا ہوتا۔ میں تو ہرگز نہ مانوں گی اور میم صاحبہ کے بچّے کی سی سب چیزیں منگا کر رہوں گی۔ نہ لاؤ گی تو لو میں گرتی ہوں اور مرتی ہوں، پاپ کاٹے دیتی ہوں۔ نہ زندہ رہوں گی نہ تم پر میرا بوجھ ہوگا۔" چڑے چڑیا نے گھبرا کر کہا، "اے ہے، ایسا غضب نہ کیجیو، اچھا اچھا، اب ہم سب کچھ منگا دیں گے۔"

یہ کہہ کر اور مس چڑیا کو دلاسا دے کر دونوں نے چونچ سے چونچ ملائی اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کیا۔ روتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ ہائے اچھوں کی صحبت اچھا بناتی ہے اور بُروں کی صحبت بُرا کر دیتی ہے۔ یہ بیرسٹر صاحب اچھے سہی، مگر ان کی صحبت سے ہمارا تو ستیاناس ہو گیا۔ ہائے ہماری لاڈلی ہاتھوں سے نکل گئی۔ ہائے یہاں تو اور کوئی چڑیا بھی نہیں، جو ہمارے دکھ درد میں شریک ہو۔ چڑے چڑیا روتے تھے اور مس چڑیا قہقہہ لگاتی تھی کہ نئے زمانے کی اولاد ایسی ہی ہوتی ہے۔



پاکستان کے آثار قدیمہ

علی اسد

پاکِستان میں چھے بڑے مشہور آثار قدیمہ ہیں۔ چار مغربی پاکِستان میں اور دو مشرقی پاکِستان میں۔ مغربی پاکستان کے چار میں سے تین سندھ میں ہیں اور ایک بالکل شمال میں ٹیکسیلا میں ہے۔ سندھ میں جو تین آثار قدیمہ ہیں، ان میں سے ایک کوٹ ڈیجی میں ہے اور دوسرا موئن جو داڑو میں اور تیسرا بنھبور میں ہے۔ مشرقی پاکستان میں جو دو ہیں، ان میں سے ایک تو پہاڑپور میں ہے، جو ڈھاکہ کے قریب ہے اور دوسرا میناًمتی میں ہے، جو برما کی سرحد کے پاس ہے۔

کوٹ ڈیجی

یہاں جس تہذیب و تمدن کے آثار پائے گئے ہیں، اس کے بارے میں یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس کی ابتدا حضرت عیسےٰ کی پیدائش سے تین ہزار سال قبل ہوئی ہوگی اور خیال کیا جاتا ہے کہ حضرت عیسےٰ کی پیدائش سے دو ہزار تین سو سال قبل تک یہ قائم رہی ہوگی۔ خیرپور کے قریب ۱۹۵۶ء میں جو کھدائی کی گئی تھی، اسی کی بدولت یہ شان دار جگہ دریافت ہوئی ہے۔ اس

دریافت کی وجہ سے پاکستان کی قدیمی تواریخ کی معلومات میں مزید پچھلے سات سو برس کا اضافہ ہو گیا، یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ کوٹ ڈیجی کی تہذیب موہن جوڈارو سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ یہاں پر برصغیر پاک وہند کے سب سے قدیمی شہر کا پتہ چلتا ہے۔ اس شہر کے چاروں طرف قلعہ کی سی دیواریں بنی ہوئی تھیں۔ اس سے اور اسی طرح کی اور دوسری باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اس شہر کی تعمیر کی ہوگی وہ یقیناً انتہائی محنتی اور لائق ہوں گے۔ چناں چہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ موہن جوڈارو کے باشندوں سے بھی پہلے رہے ہوں گے، انتہائی شائستہ ہوں گے اور بڑے اطمینان وسکون سے اپنی زندگی بسر کرتے ہوں گے۔ ان کا حکمراں طبقہ جن مکانات میں رہتا تھا، ان کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ مکانات دھوپ میں سکھائی ہوئی اینٹوں کے بنے ہوتے تھے اور ان کی چھتیں ہموار ہوتی تھیں۔ ہر مکان کے چاروں طرف قلعہ کی سی اونچی اونچی دیواریں بنی ہوتی تھیں۔ عام طور پر یہ لوگ کاشت کاری کیا کرتے تھے، مگر اس کے ساتھ ساتھ پتھر کے دھار دار اوزار اور آلے بھی بنا لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ سرخی مائل پکائی ہوئی مٹی کی چوڑیاں اور تسبیح کے سے دانے بھی بنا یا کرتے تھے۔ ان دانوں سے عورتوں کے لیے ہار بنا لیے جاتے تھے۔ اسی طرح یہ لوگ اپنے بچوں کے لیے چکنی مٹی کے کھلونے بھی بنا لیا کرتے تھے، لیکن ان لوگوں کا سب سے بڑا ہنر یہ تھا کہ یہ لوگ طرح طرح کے رنگ برنگے مٹی کے برتن بنایا کرتے تھے جو اپنی خوب صورتی اور صفائی کے اعتبار سے نہایت نادر ہوتے تھے۔

موہن جوڈرو

آج سے تقریباً ساڑھے چار ہزار سال قبل موہن جوڈرو دریائے سندھ کی وادی میں ایک نہایت شان دار شہر رہا ہوگا۔ خیال ہے کہ اس تہذیب وتمدن کی ابتدا حضرت عیسٰی کی پیدائش سے ڈھائی ہزار سال پہلے ہوئی ہوگی اور حضرت عیسٰی کی پیدائش سے ڈیڑھ ہزار

سال قبل تک قائم رہی ہوگی۔ یہاں بڑے وسیع پیمانے پر کھدائی کی گئی ہے۔ چناں چہ اس سے یہاں کے رہنے والوں کے رسم و رواج، تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کا پتہ چلتا ہے اور اسی سے ان لوگوں کے شہری اور سیاسی نظام پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ شہر بڑی عقل مندی سے آباد کیا گیا تھا۔ سڑکیں خوب کشادہ تھیں۔ پانی کے نکاس کا نہایت معقول بندوبست تھا۔ اناج کا گودام بھی سرکاری طور پر قائم تھا۔ شہر میں جابجا حمام بھی بنے ہوتے تھے۔ اینٹوں کی خوب صورت عمارتوں میں آنگن کے بعد دربانوں کے رہنے کے لیے بھی کمرے بنے ہوئے تھے۔ ان تمام باتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی شہری اور معاشی زندگی بہت باقاعدہ تھی۔

شہر میں ہر طرف چہل پہل اور گھما گھمی رہتی تھی۔ رؤسا اور بچاری کارچوبی کی قیمتی قبائیں پہنتے تھے۔ کچھ لوگ داڑھیاں بھی رکھتے تھے، جسے نہایت سلیقے سے کترو الیا کرتے تھے۔ عورتیں لہنگا یا اسکرٹ پہنتی تھیں اور طرح طرح کے زیورات سے آراستہ رہتی تھیں، یعنی گلے میں دالوں کے ہار، بازوؤں پر سونے کے جوشن اور ناک میں سونے کی کیل کا عام رواج تھا۔ عورتیں اپنے بالوں کو پنکھے کی شکل میں سنوارا کرتی تھیں۔ بچے سرخ مٹی کے کھلونوں سے کھیلتے رہتے تھے۔ موہن جوداڑو کے معاشی نظام کا دارومدار زراعت پر تھا، جس کی نگرانی خود حکومت کرتی رہتی تھی۔ حکومت نے ہر چیز کی ناپ تول کے لیے بھی باقاعدہ انتظام کر رکھا تھا۔ زیادہ تر گیہوں اور کپاس کی کاشت ہوتی تھی۔ کھیتوں کی آب پاشی کا بھی نہایت معقول بندوبست تھا۔ چناں چہ ان ہی کھیتوں کی پیداوار سے ایک بڑی بھاری آبادی خوب اطمینان وسکون سے اپنی زندگی بسر کرتی تھی۔

بنبھور

اس جگہ کے بارے میں یہ اندازہ ہے کہ حضرت عیسےٰ کی پیدائش سے سو برس پیشتر اس کی ابتدا ہوئی ہوگی اور تیرہ سو برس بعد مسیح اس کا خاتمہ ہوا ہوگا۔ بنبھور بحیرہ عرب میں گھارو کی کھاڑی پر آباد

تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ وہی دیبل کی بندرگاہ ہے، جسے محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں فتح کیا تھا۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ برصغیر ہند و پاکستان میں مسلم فاتحین کے قدم سب سے پہلے اسی مقام پر آئے۔ بہر حال یہ بات یقینی ہے کہ بنبھور کے پہلے مسلم حکمراں بنو امیہ کے عرب ہی تھے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ برصغیر میں دو چیزیں لائے، ایک تو اپنا مذہب اور دوسرے اپنی تہذیب۔ چناں چہ ان دونوں چیزوں کی بدولت اس علاقے اور اس کے آس پاس کے علاقوں کی تاریخ پر نہایت گہرا اثر پڑا، لیکن مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی بنبھور کا ایک دور گزر چکا ہے، جس کی بدولت اس کا رشتہ ان پرانی قوموں سے بھی مل جاتا ہے، جنھوں نے ظاہری طور پر تو بدھ مذہب اختیار کر رکھا تھا، مگر تہذیب و تمدن کے اعتبار سے یونانی تھیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بنبھور ہی میں سکندر اعظم کی اس بندرگاہ کا راز بھی پوشیدہ ہے، جہاں سے وہ اپنے وطن واپس ہوا تھا۔

اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ بنبھور ایک نہایت بڑی بندرگاہ تھی اور یہاں پر دنیا کے ہر ملک کے جہاز آ کر رکا کرتے تھے۔

ٹیکسلا

اس مقام کی ابتدا حضرت عیسےٰ کی پیدائش سے چھ سو برس پہلے سے بتائی جاتی ہے اور اس کا خاتمہ چھ سو سال بعد از مسیح بتایا جاتا ہے۔ ٹیکسلا شمال مغرب کی پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے۔ اس کے ایک جانب دریائے سندھ ہے اور دوسری جانب دریائے جہلم۔ ٹیکسلا نے بڑے بڑے شاہی خاندانوں اور حکومتوں کے عروج و زوال دیکھے ہیں۔ اس میں شہنشاہ اشوک کا دور بھی شامل ہے، جس نے دو سو چوہتر برس قبل از مسیح سے لے کر دو سو بتیس برس قبل از مسیح تک حکومت کی۔ ٹیکسلا مختلف اقوام کی تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہ چکا ہے۔ ان قوموں میں دیگر اقوام کے ساتھ ساتھ یونانی اور ایرانی بھی شامل ہیں لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ اس مشہور

عالم گندھارا تہذیب کا مرکز تھا، جس نے سب سے پہلی مرتبہ یونانی فلسفے کو مشرق میں پیش کیا۔ ایشیائی علوم و فنون پر گندھارا کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ اب جو گوتم بدھ کے مجسمے بنے تو ان پر رومن مجسموں کے سے لبادے بھی بنا دیے گئے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ٹیکسلا اور روم کے درمیان تجارتی اور سفارتی تعلقات قائم تھے۔ اس وسیع شہر میں گھنی آبادی تھی۔ چاروں طرف یک منزلہ مکانات بنے ہوئے تھے، جن کی چھتیں بالکل ہموار تھیں۔ مکانات کے درمیان جابجا دوکانیں اور مندر تھے۔ شاہی محل سب سے زیادہ عالی شان تھا۔ غرض ٹیکسلا اس زمانے میں دنیا کا ایک بڑا اہم مقام تھا۔ کاروبار کے علاوہ اسے بدھ مذہب کی ایک بہت بڑی درسگاہ بھی مانا جاتا تھا۔

پہاڑپور

اس جگہ کی تاریخ سات سو سال بعد از مسیح سے لے کر بارہ سو سال بعد از مسیح تک بتائی جاتی ہے، مگر مشرقی پاکستان کی قدیمی عظمت کے نشانات حضرت عیسٰے کی پیدائش سے چار سو برس قبل سے ملتے ہیں۔ اس دور میں چندر گپت موریا کی حکومت تھی۔ اس بادشاہ کا دارالسلطنت تو پاٹلی پتر تھا جو موجودہ پٹنہ شہر کے پاس تھا، مگر اس کی سلطنت مغرب میں گندھارا سے لے کر مشرق میں پہاڑپور اور مینامتی تک چلی گئی تھی۔ چندر گپت موریا کے خاندان کے بعد بنگال پر گپتا خاندان کے بادشاہوں کی حکومت رہی اور ان کے بعد پال خاندان کے بادشاہوں کا دور رہا، جنھوں نے بارھویں صدی عیسوی تک حکومت کی۔ چوں کہ پال خاندان کے فرمانروا علم و ہنر اور بدھ مذہب کے بڑے سرپرست تھے، اس لیے انھوں نے بہت سی درسگاہیں اور خانقاہیں تعمیر کروائیں۔

پہاڑپور جو ضلع راجشاہی میں واقع ہے، پال بادشاہوں کی عظمت و شکوہ کی سب سے بڑی یادگار ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی سب سے بڑی خانقاہ یہیں پر دریافت ہوتی ہے۔ اسی جگہ

پر مٹی کے برتن بنانے کا ہنر اپنے عروج پر پایا گیا ہے۔ مندروں کے اندر جو درسگاہیں تھیں، وہیں پر تمام علوم سکھائے جاتے تھے۔ چناں چہ یہاں جو تعلیمات دی جاتی تھیں اس کا پتہ ان تصاویر، کتبوں اور ان نقش و نگار سے چلتا ہے، جو پتھروں، تختیوں اور لکڑی کے تختوں اور دھات کے پتروں پر بنے ہوئے ہیں۔

مینامتی

اس مقام کی تاریخی ابتدا سات سو برس بعد از مسیح بتائی جاتی ہے اور اس کا اختتام بارہ سو برس بعد از مسیح مانا جاتا ہے۔ ۱۹۵۵ء میں کومیلا کے قریب مینامتی میں جو کھدائی کی گئی تو مشرقی پاکستان کے ایک ایسے دور کا انکشاف ہوا جس کے بارے میں اب تک بہت ہی کم واقفیت تھی۔ اس سے بنگال کی قدیم تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کے بارے میں بڑی وسیع معلومات ہوئیں۔ اس سے ایک دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ ساتویں صدی عیسوی اور بارھویں صدی عیسوی کے درمیان ایک معتبر تاریخی ترتیب قائم ہو گئی۔ علاوہ ازیں چندرا خاندان کے بادشاہوں کے متعلق مفصل معلومات بھی ہو گئیں۔ ایک اور فائدہ یہ بھی ہوا کہ ایک ایسا بدھ خاندان بھی دریافت ہو گیا، جس کے متعلق تواریخ کے ذریعے کچھ پتہ ہی نہ تھا۔ مینامتی میں سب سے نمایاں جگہ کوٹیلا مورا ہے، جہاں بالکل روایتی طریقے پر تین گنبد بنے ہوئے ہیں۔ شاید یہ بدھ مذہب کے تین خاص "جواہر" (یعنی تعلیمات) کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ "جواہر" ہیں:- (۱) بدھ (یعنی علم)۔ (۲) دھرم (یعنی قانون) اور (۳) سنگھ (یعنی نظم)۔

چناں چہ ان گنبدوں کی وجہ سے برصغیر ہند و پاکستان کے اس حصے میں چند بے مثال یادگاروں کا ایک نادر مجموعہ قائم ہو گیا ہے۔ یہاں پر سرخی مائل مٹی کے جو ابھرے ہوئے نقش و نگار اور کتبے پائے گئے ہیں، ان سے ساتویں اور بارھویں صدی عیسوی کے درمیانی حصے کے متعلق بڑی اہم معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ ان ہی کی بدولت اس زمانے کی دیو مالا، قدیمی روایات اور سماجی اور مذہبی حالات کی ایک جیتی جاگتی تصویر نظروں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔

بے وقوف ساتھی

پُرانے زمانے میں ایک شہزادی تھی۔ وہ شہزادی بہت خوب صورت تھی۔ ایک دن ایک آدمی نے کہا، "شہزادی! ایک بہت خوب صورت پرندہ ہوتا ہے۔ اس پرندے کو ہُما کہتے ہیں۔" شہزادی نے کہا، "پھر؟"

اس آدمی نے کہا، "لوگ کہتے ہیں۔ اگر اس کا سایہ کسی آدمی پر پڑ جائے تو وہ آدمی بادشاہ ہو جاتا ہے۔"

شہزادی نے کہا، "بس وہ خوب صورت پرندہ دیکھوں گی۔"

مگر ہما بہت کم ملتا ہے۔ بادشاہ نے تلاش کروایا، مگر ہُما نہیں ملا۔

شہزادی نے رنج کے مارے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ بادشاہ نے کہا، "جو کوئی ہما لائے گا اسے بہت سا روپیہ دوں گا۔"

تب ایک بڈھا چڑی مار آیا۔ اس نے کہا، "شہر سے چار میل دور ایک باغ ہے۔ وہاں ہُما آتا ہے۔"

بادشاہ کے حکم سے وہ باغ خوب سجایا گیا۔ دوسرے ہی دن ہما بھی آگیا۔ اس کے ساتھ بلبلیں تھیں۔ فاختائیں تھیں قازیں بطخیں اور مینائیں تھیں۔ توتے اور کبوتر بھی تھے۔

مگر ہُما اس باغ میں نہ اترا۔ کسی اور باغ میں جا کر اتر گیا۔ چڑی مار نے جال لگا رکھا تھا لیکن ہما پھنسے بغیر چلا گیا۔

کچھ دن بعد ہُما اڑتا ہوا پھر اس باغ میں آیا۔ اس مرتبہ بھی باغ بہت سجا ہوا تھا، مگر اس مرتبہ اس کے ساتھ چیلیں کوّے اور گدھ وغیرہ تھے۔ توتے، مینائیں، فاختائیں اور کبوتر نہیں تھے۔ ہما اور اس کے ساتھی اس مرتبہ باغ میں اتر گئے اور اترتے ہی جال میں پھنس گئے۔ چڑی مار اور دوسرے لوگ ہُما کو شہزادی کے پاس لے گئے۔ وہ بہت خوش ہوئی۔

اس نے ہما سے پوچھا، "تو پہلی دفعہ باغ میں کیوں نہیں اترا تھا؟" ہما نے جواب دیا، "پہلی دفعہ میرے ساتھ عقل مند پرندے تھے۔ انھوں نے مجھے باغ میں اترنے نہیں دیا۔ اس مرتبہ

بے وقوف پرندے میرے ساتھ آئے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا، "باغ خوب سجا ہوا ہے۔ یہیں اتر پیے۔"

میں ان کی باتوں میں آگیا۔ باغ میں اترا اور پکڑا گیا۔ اب سوچتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ بے وقوفوں کی بات نہ ماننا چاہیے۔ مانو تو وہی نتیجہ ہوتا ہے، جو میرا ہوا۔

شہزادی نے کہا، "تمھارا سایہ پڑنے سے آدمی بادشاہ ہوجاتا ہے۔"

ہما نے ہنس کر کہا، "نہیں شہزادی یہ بات یوں ہی مشہور ہوگئی ہے۔ بڑا آدمی بننے کے لیے بڑے کام کرنا پڑتے ہیں۔"

شہزادی نے خوش ہوکر ہما کو چھوڑ دیا اور وہ بھی خوش خوش اُڑ گیا۔

دن کو گھنٹوں میں کس نے تقسیم کیا

تمام پرانی قومیں کسی نہ کسی طرح دن کو مختلف حصّوں میں تقسیم کرلیتی تھیں، لیکن سورج کے سائے کو گھنٹوں کے زاویوں میں بانٹنے کا سہرا بابل والوں کے سر ہے۔ دن کی تقسیم کے لیے دائرے کو برابر زاویوں میں بانٹنے کے لیے بارہ کا ہندسہ نہایت موزوں تھا۔ سورج کا سایہ دھوپ گھڑیوں یا مخروطی میناروں سے حاصل کیا جاتا تھا، جو اسی مقصد کے لیے بنائے جاتے تھے۔ وقت معلوم کرنے کے لیے کچھ اور بھی طریقے تھے۔ مثلاً ایسی بوتلوں کا استعمال جن میں ریت بھری ہو۔ یہ ریت ایک باریک سوراخ سے نکلتی رہتی تھی اور ایک گھنٹہ ختم ہونے پر گلاس خالی ہوجاتا تھا۔ اسی طرح پانی کے گلاس اور ایک گھنٹے میں جل جانے والی موم بتی بھی استعمال ہوتی تھی۔

اخبار نونہال

مشرقی اور مغربی پاکستان کے ۶ نونہالوں کو صدارتی انعام ملا

راولپنڈی، ۳، اکتوبر ۱۹۶۵ء۔ سرکاری طور پر اعلان کیا گیا ہے کہ اس سال پاکستان کے چھے نونہالوں نے صدارتی انعام حاصل کیا۔ ان میں چار مشرقی پاکستان کے اور دو مغربی پاکستان کے ہیں۔ صدارتی انعامات "بچوں کے عالمی دن" کے موقع پر ہر سال ۱۶ سے کم عمر کے ۶ بچوں کو جرات مندی، مصوری اور اردو، بنگالی، انگریزی میں اعلا مضمون نویسی پر دیے جاتے ہیں۔ "بچوں کے عالمی دن" کی تقریبات اِس سال ہنگامی حالات کی بِنا پر منسوخ کر دی گئیں۔ صدارتی انعامات پانے والے نونہالوں کے نام یہ ہیں:۔

(۱) محمد رُوح الامین طالبِ علم جماعت ہفتم، سنگھ جانی ہائی اسکول، جمال پور، مشرقی پاکستان۔ جرات سے کام لیتے ہوئے اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنے پر۔



سیّد رفعت علی ، کراچی

(۲) محمد ربیع الاسلام طالب علم جماعت ہفتم، کمار کھالی جے۔ این۔ ہائی اسکول کشتیا، مشرقی پاکستان۔ بنگالی زبان میں مضمون "نلوتی" لکھنے پر۔

(۳) سیّد رفعت علی، طالبِ علم نہم، گورنمنٹ بوائز سیکنڈری اسکول، جیل روڈ کراچی۔ اُردو میں



سیّدہ صبا ریاض



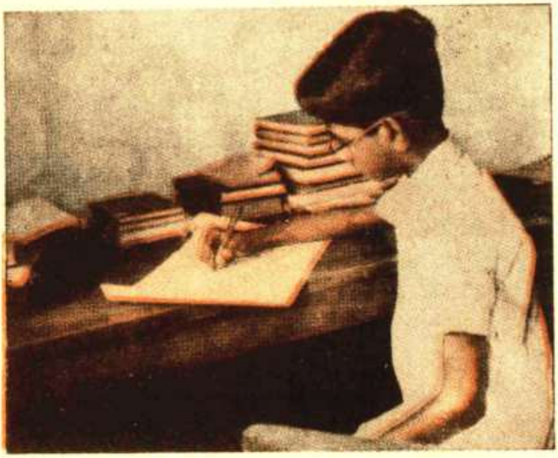
مس سونیا۔ این۔غنی

مضمون "خدمتِ خلق ہمارا قومی و اخلاقی فرض ہے" لکھنے پر۔

(۴) مس سونیا۔ این غنی طالبہ جماعت ہفتم، وقارالنسا نون اسکول، ڈھاکہ۔ انگریزی میں مضمون "دی لاس" لکھنے پر۔

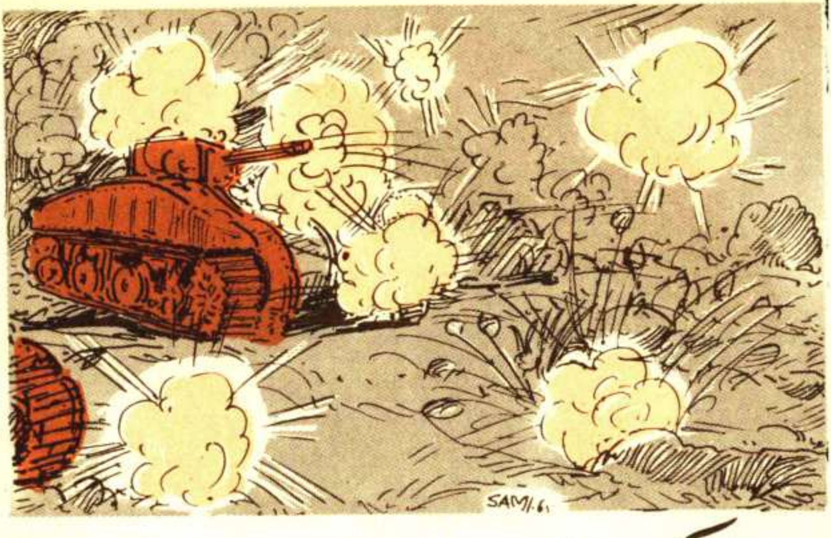
(۵) سیّدہ صبا ریاض (ساڑھے سات سالہ)، طالبہ جیسس اینڈ میری کانونٹ اسکول، لاہور۔ گیارہ سال تک کی عمر کے گروپ میں اچھی تصویر کشی پر۔

(۶) ایس۔ اے۔ کے۔ یوسف زئی، طالب علم ہشتم، گورنمنٹ لیبارٹری ہائی اسکول، ڈھاکہ۔ گیارہ سے سولہ سال کی عمر کے گروپ میں، اچھی تصویر کشی پر۔



ایس۔ اے۔ کے۔ یوسف زئی

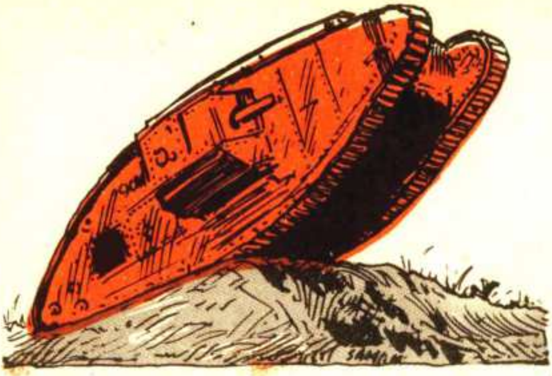
ادارہ ہمدرد نونہال ان سب نونہال بہن بھائیوں کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہے اور ان کی کامیابی اور ترقی کے لیے دعا کرتا ہے۔



ٹینک ـــ کب بنا؟ کس نے بنایا؟

پہلی جنگِ عظیم کے دوران ۱۹۱۶ء میں ایک صبح سومی (SOMME) کی جنگ میں جرمن فوج کے سپاہیوں کے منھ حیرت سے کھلے رہ گئے، جب انھوں نے دیوقامت فولادی اژدھوں کو انگریزی فوج کی طرف سے اس حصّے میں آتے دیکھا، جسے دشمنوں کے مورچوں کی درمیانی زمین NO MAN'S LAND کہا جاتا ہے۔ یہ اژدھے بالکل رینگنے والے چھوٹے کیڑوں کی طرح چلے آرہے تھے۔ ان میں سے گولیوں کی بارش ہورہی تھی اور خود ان اژدھوں پر کسی قسم کی گولی اثر نہیں کررہی تھی۔ خندقوں اور گولوں کے خولوں کو روندتے ہوئے اور زمین کو برابر کرتے ہوئے جرمنی کے تار کی باڑ کو بالکل ختم کرکے یہ اژدھے آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ جنگِ عظیم میں فولادی قلعے کا پہلا استعمال تھا، جسے ٹینک کہتے ہیں۔ جنگ میں یہی ہتھیار سب سے کارآمد ثابت ہوا۔

ٹینک ان بکتربند گاڑیوں کی بدلی ہوئی شکل ہے، جو خندقوں کے اوپر سے توپ لے جاتی تھیں۔

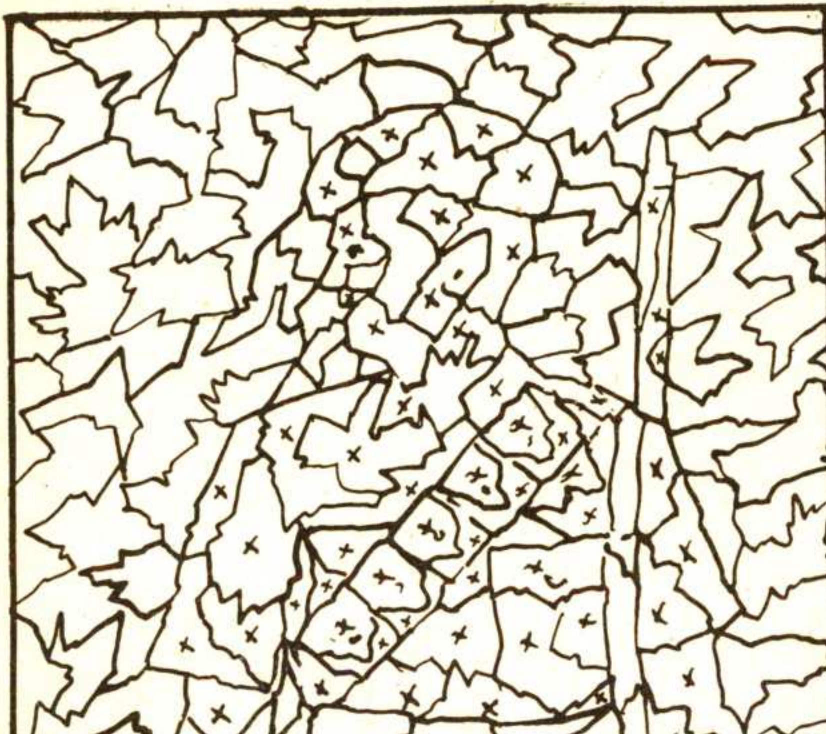


انگریزوں نے پہیوں کے بجائے
ان میں پٹّا بنا کر لگا دیا تھا، جو
رینگنے والے کیڑے کی طرح چھوٹے
چھوٹے جوڑوں کا بنا ہوا تھا۔
ٹینک کافی لمبے بنائے گئے تھے،
ہ وہ آسانی سے خندقوں کو پار
ہیں۔ ان کا اگلا حصّہ اس قدر
ٹھا دیا تھا کہ وہ کیسی ہی ناہموار جگہ ہو، اس پر آسانی سے چل سکیں، خواہ وہ خندق ہی کیوں نہ ہو۔
بنک عموماً ½ انچ موٹی فولادی چادر سے ڈھکا رہتا ہے۔ ان میں کئی توپیں اور مشین گنیں ہوتی ہیں۔
ڑے ٹینک کا وزن ۳۰ ٹن کا ہوتا ہے، مگر وزن زیادہ ہونے کی وجہ سے چلنے کی رفتار سُست ہوتی
ہے۔ اب چھوٹے ٹینک بنائے گئے ہیں اور یہ ۱۲ میل فی گھنٹے کی رفتار سے حملہ آور فوج کے ساتھ
ساتھ چل سکتے ہیں۔ ان کا نام ٹینک اس طرح پڑا کہ جب یہ انگلستان سے فرانس بھیجے گئے
ان پر لفظ "ٹینک" TANK لکھ دیا گیا، تاکہ کسی کو شک نہ ہو اور پھر یہی نام مشہور ہو گیا۔

بعد میں ٹینک بنائے گئے، وہ پانی اور زمین دونوں پر چلتے ہیں۔ پانی پر ان کی رفتار ۶
ل فی گھنٹہ اور زمین پر ۴۰ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔

جو جنگ ابھی پاکستان اور بھارت میں لڑی گئی، اس میں کھیم کرن سیکٹر میں بھارتی
نے اپنے ٹینک چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس ٹینک کا خاکہ برابر میں دیا گیا ہے۔ اب یہ پاکستانی
فوج کے قبضے میں ہے۔
ایسے کئی ٹینک اور بھی
ہیں، جو بھارتی سورما
چھوڑ کر بھاگے ہیں۔





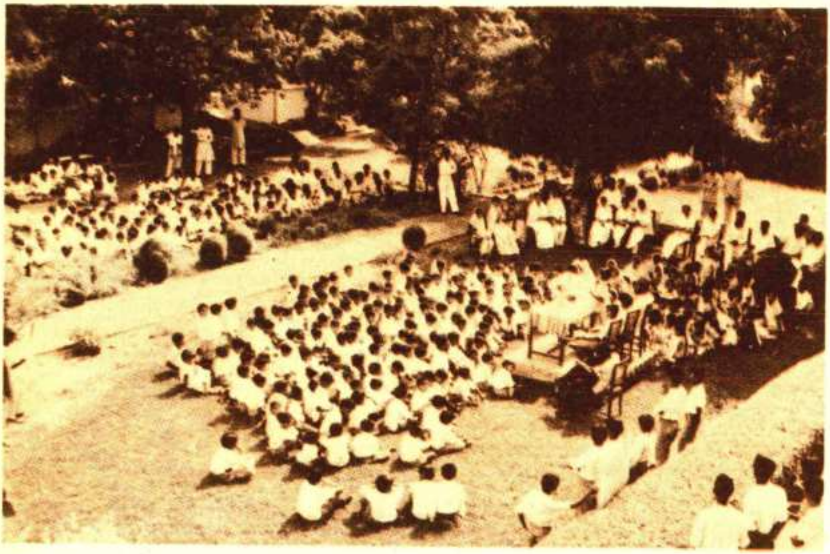
اس گورکھ دھندے کو غور سے دیکھو! سمجھے یہ کیا ہے؟
یہ پاکستان کی بہادر فوج کا ایک جاں باز سپاہی ہے۔ اس سپاہی کو ظاہر کرنے کے لیے تم صرف ان خانوں کو جن میں کانٹے (×) بنے ہوئے ہیں، رنگین پنسل سے بھر دو۔ فوجی جوان فوراً تمھارے سامنے آجائے گا۔

بچّوں کی حکومت کا صدارتی انتخاب، قریشی کام یاب ہو گئے

پچھلے دنوں کراچی کی ایک مشہور درس گاہ جامعہ تعلیم ملّی میں "بچّوں کی حکومت" کا صدارتی انتخاب بڑے زور و شور اور بڑے اچھّے انتظام کے ساتھ ہوا۔ صدارت کے دو امیدوار تھے۔ انتخاب کے نتیجے میں اظہر اللہ قریشی اپنے حریف سید نعیم احمد کے مقابلے میں دو ووٹوں کی بھاری اکثریت سے کام یاب ہوئے۔

جامعہ تعلیم ملّی میں ہر سال بچّوں کی حکومت منتخب کی جاتی ہے۔ اس حکومت کا مقصد نونہالوں میں مل جل کر کام کرنے اور قانون اور نظم و ضبط کی پابندی کرنے کی عادت پیدا کرنا ہے۔ بچّوں کی حکومت کو اسکول کے انتظام میں شریک کر کے ان میں ذمہ داری کا احساس اور فرض شناسی کا جذبہ پیدا کیا جاتا ہے۔





صدر کا انتخاب جماعت پنجم سے ہوتا ہے، تاریخ مقرّرہ پر اُمیدواروں نے کاغذات نام زدگی داخل کیے۔ طلبا نے اپنے اپنے امیدواروں کی حمایت میں جلسے کیے، جلوس نکالے، نعرے لگائے اور زبردست جوش و خروش سے انتخاب کی تیاریوں میں حصّہ لیا۔ انتخاب کے دن آخری تعارفی جلسہ ہوا، جس میں دونوں امیدواروں نے تقریریں کیں۔ اس کے بعد سیکرٹ بکس میں الیکشن آفیسر کی کڑی نگرانی میں ہر جماعت نے پورے نظم و ضبط کے ساتھ ووٹ ڈالے۔ دوسرے روز اظہر اللہ قریشی کی کام یابی کا اعلان کیا گیا اور ان کے حامیوں نے ایک شان دار جلوس نکالا۔

صدارتی انتخاب کے بعد ہر جماعت سے تین تین وزیروں کا انتخاب ہوا اور صدر نے ۲۱ وزیروں کی کابینہ کی تشکیل کی۔

اُمِّ کُلثوم

عرب کی ملکۂ ترنم



عرب دنیا کی مشہور گانے والی ام کلثوم کی یہ تصویر جناب فوزی عثمان نے عربی ٹائپ رائٹر سے بنائی ہے۔ انھوں نے جدّت یہ کی ہے کہ ام کلثوم کے مشہور عربی گانے "انت الحب" کے بول بھی اس کی تصویر میں ٹائپ کر دیے ہیں، یعنی تصویر بنانے کے لیے جو الفاظ انھوں نے ٹائپ کیے ہیں وہ ام کلثوم ہی کے ایک پسندیدہ گانے کے الفاظ ہیں۔

ام کلثوم کی مقبولیت کا اندازہ تمھیں اس بات سے ہوگا کہ جب اس کے گانے کا پروگرام ہوتا ہے تو لوگ وقت مقررہ سے پہلے ہی اپنے اپنے ریڈیو سیٹ یا ٹیلی وژن سیٹ کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔

قاضی شفیق الرحمن۔ کراچی

انعامی تصویر

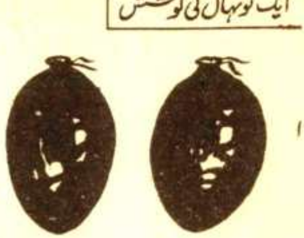


ذرا اس کارٹون کا عنوان بتاؤ۔ صحیح اور مزے دار عنوان بتانے والے
نونہال کو ایک اچھی سی کتاب انعام میں دی جائے گی۔ ایک سے زیادہ صحیح عنوان
آنے کی صورت میں ایک نونہال کا نام قرعے سے انعام کے لیے نکال لیا جائے گا۔
عنوان سوچتے وقت مشہور مصرعوں اور شعروں کو بھی ذہن میں لا سکتے ہو۔

ایک نونہال کی کوشش

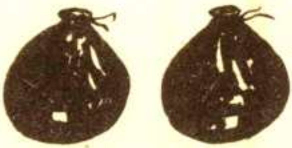
بچوں کا ٹیلی فون

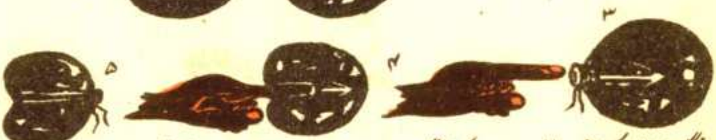
امدادی اشیا: دو ہوا سے بھرے ہوئے غبارے اور تھوڑا سا تاگہ



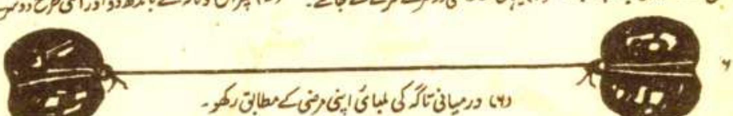
(۱) دو ہوا سے بھرے ہوئے غبارے لو۔

(۲) اب دونوں کی آدھی آدھی ہوا خارج کردو۔





(۳) انگلی سے اندر کی جانب دباؤ۔ (۴) یہاں تک کہ انگلی دوسرے سرے سے جا ملے۔ (۵) پھر ان کو تاگہ سے باندھ دو اور اسی طرح دوسرے کو بھی بنالو۔



(۶) درمیانی تاگہ کی لمبائی اپنی مرضی کے مطابق رکھو۔



(۷) ٹیلی فون تیار ہوگیا اب منہ سے اپنے دوست سے باتیں کرو۔

نوٹ: بات کرتے وقت اس بات کا خاص طور پر خیال رکھو کہ درمیانی تاگہ میں لچک پیدا نہ ہو۔

تسلیم الٰہی زلفی، کراچی

صحت مند نونہال

اس صفحہ پر ہر ماہ صحت مند نونہالوں
کی تصویریں شائع کی جائیں گی۔
جلدی سے اپنی تصویر بھیج دو!



ایم۔ اے۔ ندیم صدیقی
ایم۔ قاسم صدیقی، وہاڑی



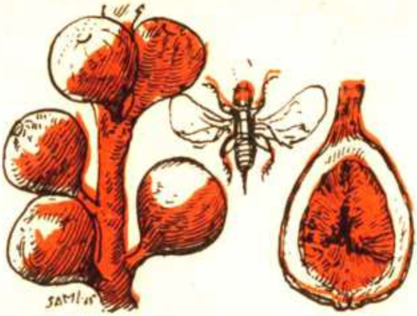
ریحانہ عقیل، کراچی



فرح دیبا، راولپنڈی



اسلم ولد احمد، کراچی



انجیر

جب بھی آپ سمرنا کا انجیر کھائیں تو آپ اس ننھے سے انجیر کے پَروں والے کیڑے کو نہ بھولیے، جو اس انجیر کو میٹھا بناتا ہے۔ یہ انجیر دنیا میں سب سے بہتر مانے جاتے ہیں۔ آپ انھیں تازہ کھائیں یا خشک، مگر ان کے ذائقے میں بالکل فرق نہیں آتا۔

یہ چھوٹا پَر والا کیڑا کیپری انجیر (CAPRI-FIG) سے زرگل (پھول کا زیرہ) لاکر دو نسلوں کی انجیروں کا میل کرتا ہے۔ اگر یہ زرگل لاکر کلی کے اندر نہ ڈالے تو یہ انجیر پک نہیں سکتا۔ یہ بھرا ہوا امرود نما انجیر، جس میں ذائقے دار گودا ہوتا ہے، اصلی پھل نہیں ہوتا اِس خول کے اندر ہی انجیر کے پھول بڑھتے ہیں اور پک کر تیار ہوتے ہیں۔ یہ کیڑا بالکل صحیح وقت پر انجیر میں پرورش پاتا ہے۔ ان انجیروں کے گچھوں کو سمرنا انجیر کے درختوں پر لٹکا دیتے ہیں۔ ان میں سے کیڑے نکل کر انجیر کے نیچے سوراخ میں سے اندر داخل ہوتے ہیں اور اس طرح انجیر کی ایک نئی نسل پیدا ہونے میں مدد دیتے ہیں۔

سمرنا کے انجیر کا جھاڑی نما درخت اٹھارہ اور بیس فیٹ سے زیادہ اونچا نہیں ہوتا۔

انجیر کی کئی قسمیں ہیں۔ کچھ بیلوں پر اور کچھ درختوں پر لگتے ہیں۔ پھل کی رنگت اودی، پیلی اور سفید ہوتی ہے۔ سال ہا سال سے مغربی ایشیا اور شمالی یورپ میں پکے اور کچے انجیر وہاں کے باشندوں کی خوراک میں شامل ہیں۔ اس کے رس کو بھی پیتے ہیں اور اس سے کپڑے بھی رنگے جاتے ہیں۔ پتے ہاتھی دانت پر پالش کرنے کے کام آتے ہیں اور چھال کی ڈوری بنائی جاتی ہے۔

سردی کے موسم میں

سمیع آرٹسٹ



پیارے بچو! سردی کے موسم میں
تنگ کپڑے نہیں پہننے چاہییں،
خاص کر سینے پر، کیوں کہ ایسا کرنے
سے سانس لینے میں تکلیف ہوتی
ہے اور پھیپھڑے اتنے نہیں پھیلتے
جتنا ان کو پھیلنا چاہیے۔



سردیوں میں کپڑے بدلتے وقت اس
بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ جسم کو
ہوا کا جھونکا نہ لگنے پائے۔ ایسی جگہ
کمرے میں کپڑے پہننے چاہییں، جہاں
سرد ہوا سینے وغیرہ میں نہ لگے۔ احتیاط
نہ کرنے سے نمونیا وغیرہ کا خطرہ رہتا ہے۔

سردی کے موسم میں صرف ایک پتلا اُونی
بنیان جسم سے لگا ہوا پہننا چاہیے۔ اس
پر قمیص اور معمولی سوئٹر یا ہلکی رُوئی کی
صدری یہ بالکل کافی ہیں۔ اُونی بنیان کی
وجہ سے جسم کی حرارت جسم میں رہے گی۔
سوتی بنیان میں جو پسینہ ہوتا ہے، وہ نقصان کرتا ہے۔





سردیوں میں کمرے کے تمام دروازے کھڑکیاں
بند کرکے سونا غلط ہے۔ تازہ ہوا ضرور کمرے
میں آنی چاہیے۔ کھڑکی کھول کر اس پر پردہ
ڈال دینا چاہیے اور پلنگ اس طرح ایک
طرف بچھانا چاہیے کہ ہوا کے جھونکے پلنگ
کی طرف نہ آئیں۔



چہرہ ڈھک کر سونا صحت کے لیے
نقصان دہ ہے۔ چہرہ کھول کر
سونا چاہیے، تاکہ تازہ ہوا پھیپھڑوں
کو ملتی رہے اور خون صاف اور
صحت مند رہے۔

بہت زیادہ کپڑے جسم پر لادنے سے
چستی ختم ہو جاتی ہے۔ چوں کہ جسم
ہر طرف سے کسا رہتا ہے، اس وجہ
سے بچے سست رہتے ہیں۔





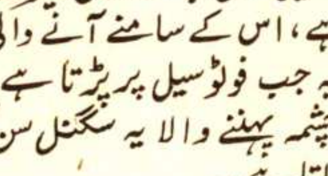
سر کو خوب چاروں طرف سے لپیٹ لینا
اور پیروں کو ننگے رکھنا نقصان دہ ہے۔
سردی میں ہمیشہ پیروں پر موزے پہننے
چاہییں، تاکہ پیر گرم رہیں۔ سردی
پیروں سے ہی لگتی ہے۔ سر پر معمولی
ٹوپی کافی ہے۔



رات کو سوتے وقت پیٹ کو
بھی سینے کی طرح گرم رکھو۔ سرد
ہوا نہ لگنے پائے۔ سرد ہوا
لگنے سے دست آنے لگتے ہیں
اور بدہضمی کی تکلیف ہو جاتی
ہے۔

اندھوں کے لیے بھی چشمہ بنالیا گیا

اب ایک ایسا چشمہ ایجاد کر لیا گیا ہے۔ جس کی مدد سے آنکھوں سے محروم لوگ چھڑیوں اور راستہ بتانے والے کتّوں کے محتاج نہیں رہے۔ اب تک یہ ہوتا تھا اندھوں کی رہنمائی کرنے والے کتّوں کو خاص قسم کی تربیت دی جاتی تھی۔ پھر نابینا شخص کتّے کے گلے اور کمر سے بندھی ہوئی زنجیر اور تسموں کو پکڑ کر چلتا تھا۔ کچھ اندھے ایک خاص قسم کی چھڑی لے کر چلتے تھے۔ چند ہفتے پہلے ایک شخص نے اس چھڑی میں ایک ٹرانسسٹر ریڈیو لگا دیا تھا، راستے میں کوئی رکاوٹ آنے پر اس ریڈیو میں سگنل آنے لگتے تھے۔ اس عرصے میں ایک ۱۷ سال کے امریکی لڑکے ریلیف ہوچکس نے یہ چشمہ ایجاد کر لیا، جو اندھوں کی رہنمائی کے لیے بہترین ایجاد ہے۔ اس چشمے کے لینس پر آگے کو نکلے ہوئے دو فوٹو سیل لگے ہوئے ہیں۔ چشمے کی کمانی کے سروں پر دو ائیر فون لگے ہوئے ہیں۔ جو تار کے ذریعے جیب میں رکھی جانے والی بیٹریوں سے ملے ہوئے ہیں۔ جو شخص یہ چشمہ پہنتا ہے، اس کے سامنے آنے والی رکاوٹوں اور چیزوں کی روشنی کی چمک یا سایہ جب فوٹو سیل پر پڑتا ہے تو یہ آواز کے سگنل نشر کرنے لگتا ہے۔ چشمہ پہننے والا یہ سگنل سن کر ہوشیار ہو جاتا ہے اور رکاوٹ سے بچ جاتا ہے۔



ایک ماہر لڑکا

عبدُالصمد صارم

اگلے وقتوں کا ذکر ہے کہ ایک یتیم لڑکا اپنے غریب دادا کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کا دادا پہاڑوں سے پتّھر کاٹ کاٹ کر لایا کرتا تھا۔ بچّہ چوں کہ کم زور تھا لہٰذا دادا کا ہاتھ نہ بٹا سکتا تھا۔ وہ ہر روز اپنے دادا کے سَاتھ جایا کرتا، تاکہ اسے پتّھر کاٹتے دیکھے۔ اِس طرح اسے اپنے دوستوں کے سَاتھ کھیلنے کودنے کا موقع نہ ملتا، مگر وہ اکیلا ہی پتّھروں کے ٹوٹے پھُوٹے ٹکڑوں کے ساتھ کھیلتا رہتا اور انھیں توڑتا پھوڑتا رہتا۔ وہ علیٰحدہ بیٹھا ہُوا چھوٹے چھوٹے اوزاروں سے مختلف قسم کے مجسّمے بنایا کرتا، حتّٰی کہ وہ پتّھروں کی تراش خراش میں اس قدر ماہر ہوگیا کہ اس کا دادا حیرت کرنے لگا۔ ایک دن اس نے لڑکے سے کہا "بیٹا، اللہ نے چاہا تو تو بڑا بھاری سنگ تراش ہوگا اور دور دور تیری شہرت پھیل جائے گی۔"

جب وہ لڑکا شام کو گھر واپس آتا تو اس کی دادی پوچھتی، "ارے او منّے سے سنگ تراش! آج تو نے اپنے لیے کیا چیز بنائی؟ پھر وہ اسے گود میں لے کر بیٹھ جاتی اور اچھے اچھے گیت اور مزے دار قصّے سُناتی۔ لڑکا ان گیتوں کو مجسّموں کی صورت میں پیش کرنا چاہتا اور جب اگلے دن اپنے دادا کے ساتھ جاتا تو اپنے چھوٹے چھوٹے اوزاروں سے طرح طرح کے ننھے ننھے مجسّمے بناتا۔

شہر میں ایک بڑا بھاری مال دار آدمی رہتا تھا، جو اکثر اپنے دوستوں کی دعوت کیا کرتا۔ لڑکے کا دادا جب اس امیر آدمی کے گھر برتن دھونے جایا کرتا تو وہ بھی اس کے ساتھ جاتا اور برتن دھوتا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ اس امیر نے اپنے دوستوں کی دعوت کی۔ لڑکا بھی برتن دھونے اپنے دادا کے ساتھ گیا ہوا تھا۔ ایک خادم جب کھانے کے کمرے میں برتن وغیرہ لے کر گیا تو بڑے زور

سے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی، سب لوگ جدھر سے آواز آئی تھی، اس طرف دیکھنے لگے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ملازم خوف سے کانپتا ہوا اور "ہائے اب کیا ہوگا؟" کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل رہا ہے۔ لوگوں نے پوچھا، "کیا ہوا؟" کہنے لگا "مجھ سے وہ مجسمہ ٹوٹ گیا، جو زینت کے لیے میز پر دھرا جاتا تھا۔ اب میز کو کس چیز سے آراستہ کیا جائے گا؟ صاحب نہ معلوم مجھے کیا کیا کہیں گے؟ وہ مجسمہ، جس کے بارے میں صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ اس کا بہت زیادہ خیال رکھنا، کیوں کہ یہ بہت ہی نایاب ہے اور بڑا ہی قیمتی ہے۔"

تمام ملازم خوف سے کانپنے لگے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے "اچھا اب کیا ہو؟ بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

لڑکے نے جو سب کو پریشان دیکھا تو برتن چھوڑ چھاڑ نوکروں کی طرف دوڑا۔ پوچھنے لگا کہ کیا ہوا؟ پتہ چلا کہ ایک مجسمہ ٹوٹ گیا ہے۔ کہنے لگا، "یہ بھی کوئی پریشانی کی بات ہے۔ میں ابھی ابھی اس سے اچھا مجسمہ بنا دوں گا۔" بچے کے شیخی بگھارنے پر سب ہنسنے لگے۔

لڑکے نے کہا "میں سچ کہہ رہا ہوں۔ آپ لوگ یقین کیجیے، میں اس سے بہتر مجسمہ بنا دوں گا، کیوں کہ میں مجسمہ سازی میں بڑا ماہر ہوں۔" جس شخص سے مجسمہ ٹوٹا تھا، اس نے مذاق اڑاتے ہوئے تھوڑی سی مٹی لڑکے کے سامنے رکھ دی اور کہا "اچھا بنا، کیسے بناتا ہے۔ ذرا سی دیر میں تو کیسے اچھا عمدہ مجسمہ بنا دے گا، ہم بھی دیکھیں، تھوڑی سی دیر میں تو کیا بنائے گا۔" لڑکے نے کہا، "میں مجسمہ سازی میں بڑا ماہر ہوں، دیکھ لینا کیسا بناتا ہوں۔" لوگوں نے کہا "بنانے دو۔"

لڑکے نے چھری لے کر مٹی سے شیر بنایا۔ ملازموں نے دیکھا تو حیران رہ گئے۔ کہنے لگے "واہ کیا خوب مجسمہ بنایا ہے۔ یہ تو اس ٹوٹے ہوئے مجسمے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ ملازم نے مجسمہ اٹھا کر میز پر رکھ دیا۔ میز پر رکھا تو وہ اور بھلا لگنے لگا۔ کہنے لگا کہ بے شک یہ ٹوٹے ہوئے مجسمے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ جب امیر آدمی اور اس کے دوست کھانے کی میز پر بیٹھے اور اس پر شیر دھرا دیکھا

تو سب کو پسند آیا۔ کہنے لگے کہ یہ شیر تو آرٹ کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ مجسّمہ کہاں سے آیا؟

امیر آدمی بولا" دوستو، مجھے پتہ نہیں کہ یہ مجسّمہ کہاں سے آیا، جس طرح آپ کو تعجّب ہے کہ اتنا اچھا مجسّمہ کہاں سے آگیا۔ مجھے بھی تعجّب ہے۔"

اس نے بڑے باورچی کو بلا کر پوچھا، "یہ عجیب مجسّمہ تم کہاں سے لائے؟" اس نے کہا، "باورچی خانے میں ایک یتیم بچّہ ہمارے ساتھ کام کر رہا ہے، اس نے ابھی ابھی بنایا ہے۔"

سب لوگ حیرت سے بولے،" ابھی ابھی بنایا ہے؟ ایک یتیم بچّے نے، جو برتن دھونے پر ملازم ہے۔ ذرا اسے بلا تو لاؤ، دیکھیں کون لڑکا ہے؟"

لڑکا آیا تو مالکِ مکان بولا،" بیٹا تو نے تو کمال کر دیا ہے، تیرا کیا نام ہے؟ تو نے مجسّمہ سازی کس سے سیکھی؟ تو نے ایسا اچھا مجسّمہ بنایا کہ تمام آرٹسٹ حیران ہیں۔"

لڑکے نے کہا" میرا نام حَسَن ہے، سوائے میرے دادا کے جو پتھر پھوڑتا ہے اور کوئی میرا استاد نہیں۔"

تمام مہمان لڑکے کے ارد گرد جمع ہو گئے اور اس کے بنائے ہوئے مجسّمے پر تعجب کرنے لگے۔ مہمانوں میں بڑے بڑے ماہر فن کار بھی تھے انھوں نے کہا کہ یہ لڑکا کسی زمانے میں بڑا بھاری مجسّمہ ساز ہو گا۔ انھوں نے اسے اپنے ساتھ کھانے پر بٹھا لیا۔ امیر آدمی نے کہا کہ آج دعوت اس چھوٹے سے مجسّمہ ساز کے اعزاز میں ہے۔

اگلے دن اس مال دار شخص نے لڑکے کو اپنے گھر بُلایا اور اسے بڑے بڑے ماہر سنگ تراشوں کے سپرد کر دیا کہ وہ اس کی تربیت کریں۔ حَسَن نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

چند سال کے بعد حَسَن دنیا کا مشہور ترین مجسّمہ ساز بن گیا۔ اب وہ بجائے مٹّی اور سادہ پتّھروں کے سنگِ مرمر اور قیمتی پتّھروں کے مجسّمے بنایا کرتا اور دُنیا کو اپنے کمال سے حیران کیا کرتا۔



اُونچا مینار

کوثر چاندپوری

صابر نے غریب گھرانے میں جنم لیا۔ اس کے ماں باپ بالکل ان پڑھ تھے۔ الف کے نام بے بھی نہیں جانتے تھے۔ ان کے گھر علم کا دیا نہ جانے کب سے نہیں جلا تھا۔ ایک کونے میں پھاوڑوں، چھوٹی بڑی کدالوں اور بانس کی ٹوٹی پھوٹی ڈلیوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا۔ صابر کا باپ عابد مزدوری کیا کرتا تھا۔ یہی سب چیزیں اس کی جائداد تھیں۔ ان میں سے کئی ایک عابد کے باپ نے ترکے میں دی تھیں۔ صابر کی چھوٹی سی اندھیری دنیا بھی انھیں پھاوڑوں، کدالوں اور ڈلیوں کے گرد گھومتی رہتی۔ باپ مزدوری کرتا رہتا اور صابر سڑکوں اور گلیوں میں آوارہ اور اپنے ہی جیسے لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف رہتا۔ اس محلّے کے لڑکے بارہ تیرہ برس تک یوں ہی کھیلتے اور آوارہ گھومتے، پھر نوکری کر لیتے یا مزدوری شروع کر دیتے۔ صابر جَو اور چنا اور ایسا ہی موٹا جھوٹا اناج کھا کر، میلے کچیلے کپڑے پہن کر جنگل کے ایسے پودے کی طرح بڑا ہوتا رہا، جس کی جڑ میں پانی ڈالنے کی فکر کسی کو نہیں ہوا کرتی۔ صابر اسی کس مپرسی کے عالم میں عمر کی

شات سیڑھیاں چڑھ گیا۔ اس کا عقیقہ بھی نہیں ہوا اور بسم اللہ کی رسم بھی ادا نہیں ہوئی۔ شات سیڑھیوں کے آگے اور نہ جانے کتنی سیڑھیاں تھیں، وہ سب اتنے اندھیرے میں تھیں کہ اور اوپر چڑھے بغیر صابر انھیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔

ایک روز شام کو عابد تھکا ہارا کام سے لوٹا تو گھر میں ماسٹر امیر حسن بیٹھے تھے۔ یہ اس کے بہت دور کے رشتے دار ہوتے تھے، لیکن کبھی اس کے یہاں آتے نہیں تھے۔ عابد نے کنکھیوں سے انھیں دیکھا اور علیک سلیک کرنے کے بعد پھاوڑہ زمین پر ڈال دیا، پھر ڈلیا کونے میں لٹکا دی۔ یہی سب اس کا پورٹ فولیو تھا۔ اس کے بعد ہاتھ دھوکر وہ امیر حسن کے پاس آ بیٹھا۔

"کیسے بھول پڑے؟" اس نے پوچھا

"ایک بات پوچھنے آیا تھا۔"

"کیا؟"

"صابر کو اسکول میں کب تک داخل کر دگے؟"

"کبھی نہیں!"

"ایسا مت کہو بڑے بھیا، اسے اسکول بھیج دیا کرو، پڑھ لکھ کر آدمی بن جائے گا۔"

"ان پڑھ سب جانور ہیں تمھارے نزدیک؟"

"ایسا تو نہیں ہے، مگر علم کے بغیر آدمی انسان نہیں بنتا۔ میں کہتا ہوں صابر کو اسکول میں داخل کر دو۔ میں اسے پڑھاؤں گا۔"

"پڑھ کر کیا کرے گا۔ وہی بات ہوگی کہ پڑھیں فارسی اور بیچیں تیل۔ پڑھنا لکھنا ہمارا کام نہیں بھائی۔ ہمارے باپ دادا نے کب پڑھا تھا، جو ہم اسے پڑھائیں۔ وہ سب ڈلیا ڈھوتے اور پھاوڑہ چلاتے تھے۔ پڑھنے والوں کی مت اوندھی ہو جاتی ہے، وہ گھر گھاٹ میں سے کہیں کے نہیں رہتے۔"

"یہ بات نہیں بڑے بھیا، دنیا آگے کو جا رہی ہے۔ ہمارے ماں باپ کا زمانہ اور تھا، ہمارا اور ہے۔ علم کی یوں تو ہر زمانے میں ضرورت رہی

ہے، آج کل اور زیادہ ہے۔ دیکھو نا ہر طرف اسی کا نور پھیلا ہوا ہے۔ ریل سے ہوائی جہاز اور ہوائی جہاز سے ایٹم تک علم ہی کا چراغ جل رہا ہے۔"

"بس رہنے دو، میں ان باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔ بھلا ریل اور جہاز کو علم سے کیا تعلق اور ایٹم کو علم کے زور سے بناتے تو وہ آدمیوں کو کیڑے مکوڑوں کی طرح کیوں مار دیا کرتا۔"

"عابد بھیا، اسی لیے میں کہتا ہوں کہ صابر کو پڑھاؤ۔ پڑھنے کے بعد آدمی اپنے علم کی طاقت سے ایٹم کو انسانوں پر گرنے نہیں دے گا، وہ سب کو مل جل کر پیار محبت سے رہنا سکھائے گا۔ صابر کو میں دیکھتا ہوں سڑکوں پر گالیاں بکتا پھرتا ہے، وہ بھی کیا کرے، جو کچھ اپنے آس پاس دیکھتا ہے وہی کرتا ہے، ضروری نہیں کہ آدمی ایک ہی راستے پر چلتا رہے، تم اپنے ماں باپ کے راستے پر چل کر ایک انچ آگے نہیں بڑھے، وہیں ہو، جہاں تھے۔ اب صابر کو راستہ بدل کر دنیا کے ساتھ چلنے دو۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو امیر ماسٹر، تم پڑھ لکھ کر ماسٹر بن گئے تو کیا سب ایسے ہی ہو جائیں گے؟"

"ضرور ہو جائیں گے، بلکہ وہ مجھ سے بڑے ہوں گے۔ جج، بیرسٹر اور وزیر۔"

عابد ذرا نرم پڑا۔ سوچا کیا ہرج ہے صابر کو پڑھنے ہی دوں۔ وہ ہے بھی بڑا دھان پان، اینٹیں اور مٹی کیوں کر ڈھو سکے گا!

"فیس کیا لگے گی؟"

"یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ سمجھ لو کچھ نہیں لگے گی۔"

"علم کسی قبر پر بٹنے والی مٹھائی تو ہے نہیں، جو مفت مل جائے۔"

"پھر میں مُردوں کے نام کی چیزوں میں سے حصّہ نہیں لینا چاہتا۔ میرا لڑکا اسکول نہیں جائے گا!"

"تم فیس دے دیا کرنا چار آنے مہینہ!"

"تو کل سے صابر کو اسکول میں

داخل کرلو۔ ذرا دھیان سے پڑھانا، بُرے کاموں میں نہ پڑ جائے۔"

امیر حسن ماسٹر چپ رہے۔ وہ آج بہت کام یاب رہے تھے۔ اپنے عزیزوں کے بارہ لڑکوں کے نام اسکول میں داخل کرنے کے لیے لکھ چکے تھے۔ صابر یہ باتیں سن کر سوچنے لگا، "کیا سچ مچ ابا مجھے اسکول بھیجیں گے؟ مَیں پڑھوں گا! ذرا دیر کے لیے اس کے چھوٹے سے دماغ میں یہ خیال آیا کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ پھر ایک دَم یہ خیال اس طرح ذہن سے نکل گیا، جیسے چمگادڑ کسی اندھیرے کونے سے نکل بھاگتی ہے۔ عمر کی وہ سیڑھیاں، جو لمبے زینے کی شکل میں بہت اونچائی تک چلی گئی تھیں، صاف دکھائی دینے لگیں، جیسے کسی نے بجلی کا بٹن دبا کر اجالا پھیلا دیا ہو۔

صَابر اگلے دن سے اسکول جانے لگا۔ اسے حروف پہچاننے میں بڑی مشکل پیش آئی۔ کئی دن تک وہ انھیں رٹتے رٹتے اکتا گیا، مگر جانتا تھا کہ بھاری کدال اور پھاوڑے کا اٹھانا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ یہ سوچ کر اس نے حروف کی شکلیں پہچاننے میں اور زیادہ کوشش کی۔ دس پانچ دن کے اندر ہی وہ اس کام سے مانوس ہوگیا۔ ایک، دو، تین اور پھر دھیرے دھیرے اس نے سارے حروف پہچان لیے۔ وہ خوب دل لگا کر پڑھتا رہا۔ سال بھر میں دو کتابیں ختم کرلیں۔ سلیٹ پر ہندسے بھی لکھنے لگا، پھر اس نے سوال نکالنے شروع کردیے اور اس کے بعد تو اس کا ذہن پانی کے جھرنے کی طرح علم کے میدان میں بہنے اور دوڑنے لگا۔ یہ جھرنا جتنا جتنا آگے بڑھتا صابر کو اتنا ہی بھلا لگتا۔ اس کے باپ کو پتہ بھی نہ چلا کہ بیٹا اتنے شوق اور محنت سے پڑھ رہا ہے۔ وہ ان اونچی عمارتوں کی اوپر اٹھتی ہوئی دیواروں کو دیکھنے اور ناپنے میں لگا ہوا تھا، جو اس کی کھودی ہوئی بنیادوں پر بن رہی تھیں۔ وہ دیواریں بنانے والے کاری گروں کو پہلے زمین پر کھڑے ہو کر اینٹیں دیا کرتا تھا، پھر باڑ پر

چڑھ کر اینٹیں دینے لگا۔ اس کے بعد اور اونچی پاڑ پر کھڑا ہونے لگا۔ ایک منزل بنی، پھر دوسری اور پھر تیسری بننے لگی۔ عابد خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ وہ ان گھروں میں رہنے کے سپنے نہیں دیکھ رہا تھا۔ دوسروں ہی کے لیے ان کی تعمیر میں لگا ہوا تھا۔ اب تک اسے خبر نہ تھی کہ صابر کے اسکول میں بھی ایسی اَن گنت عمارتیں بن رہی ہیں، وہاں ایک بہت بڑی کالونی آباد کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ وہ عمارتیں اینٹوں سے نہیں، کتابوں سے بنائی جا رہی تھیں، جس طرح اینٹ پر اینٹ رکھ کر کاری گر دیوار کو اونچا کرتا ہے، اسی طرح امیر حسن ماسٹر اور ان کے ساتھی کتاب پر کتاب رکھ کر دماغ اور ذہن کا اونچا مینار بنانے میں لگے ہوئے تھے۔ صابر نے آٹھواں درجہ پاس کر لیا تو ماں باپ ہی نہیں، محلے کی بہت سی بڑی بوڑھی عورتیں بھی خوش ہوئیں۔ سب نے ہاتھ اٹھا کر صابر کو دعائیں دیں۔

ایک بولی،" اللہ کرے صابر بہت بڑا منشی بن جائے۔"

دوسری نے کہا،" وہ میرے گاؤں میں پٹواری ہو کر جائے!"

تیسری نے دعا کی،" خدا کرے وہ ڈاکیہ بن جائے!"

صابر ان سب کی باتیں سن کر ہنسا اور سب سے کہا،" منشی، پٹواری اور ڈاکیہ میں نہیں بنوں گا۔ میرے لیے دعا کرو کہ بہت بڑا آدمی بن جاؤں۔"

عابد بھی اب بیٹے کی تعلیم سے دل چسپی لینے لگا تھا۔ وہ اس سے پوچھتا،" کیا پڑھ رہے ہو؟ ماسٹر کب تک بن جاؤ گے؟"

ایک دن پوچھا،" ماسٹر سے بڑا آدمی کون ہوتا ہے، تھانے دار؟ صابر تم تھانے دار ہی بن جانا۔"

ماں باپ ہی کو نہیں، محلہ بھر کے مَردوں اور عورتوں کو صابر کی پڑھائی سے گہری دل چسپی تھی۔ سب اسی سے خط لکھوانے لگے تھے۔ آہستہ آہستہ صابر نے میٹرک، پھر انٹرمیڈیٹ اور اس کے بعد بی۔ اے پاس کر لیا۔ پڑھائی کا خرچ اس کا باپ ہی اٹھا

رہا تھا۔ صابر جوان ہو چکا تھا اور اب اس کا جی چاہ رہا تھا کہ آگے پڑھے، قانون پاس کر کے وکیل بن جائے۔ سوال فیس وغیرہ ہی کا تھا۔ عابد نے اُسے قانون پڑھنے کے لیے پھر کالج میں داخل کرا دیا۔ وہ دن کو مزدوری پر جاتا اور رات کو بازار کے ایک حصّے میں دکان پر پہرہ دینے کی نوکری کرتا۔ اس طرح زیادہ پیسے کما کر وہ اپنے صابر کے عمدہ کپڑے بناتا، اس کے لیے کتابیں خریدتا اور اس کی فیس ادا کرتا۔ صابر کو دو سال میں وکیل بن جانا چاہیے تھا، مگر ایک سال فیل ہو گیا۔ اس طرح تین برس میں وکیل بن سکا۔ قانون کی ڈگری لے کر وہ ایک مشہور وکیل کی نگرانی میں وکالت کرنے لگا۔ سب سے پہلا مقدمہ جو اس نے عدالت سے جیتا، وہ محلّے ہی کے ایک غریب آدمی کا تھا۔ اس کا مکان ایک شخص نے دبا لیا تھا۔ صابر نے مقدمہ لڑا اور مکان اسے واپس دلایا۔

صابر وکالت میں ترقی کرتا رہا۔ اس نے الگ اپنا دفتر قائم کر لیا۔ عابد اب مزدوری کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ بوڑھا بہت ہو گیا تھا۔ صابر نے اسے کام کرنے سے روک دیا۔

سُنا جا رہا ہے اُسے جلد ہی مجسٹریٹ بنایا جانے والا ہے۔ یہ امید رکھی جا سکتی ہے کہ اس کے بعد وہ جج بن جائے گا۔

لطیفے

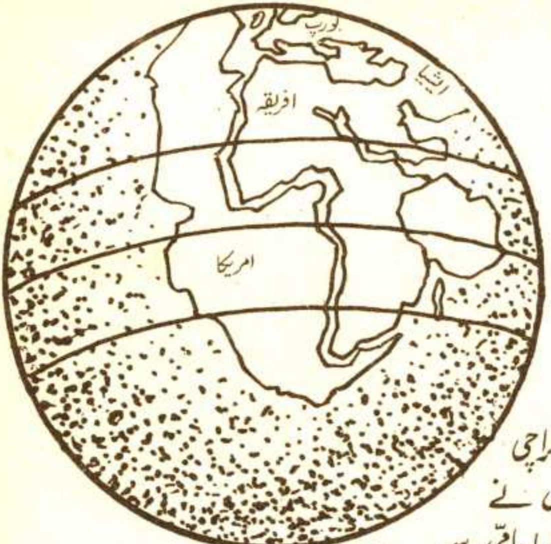
لڑکا: (ڈاکٹر سے) میرے کان میں اٹھنّی گھس گئی ہے، اسے نکال دیجیے۔
ڈاکٹر: کب گھسی تھی؟
لڑکا: کوئی چھے مہینے ہو گئے ہوں گے۔
ڈاکٹر: تو اب تک نکلوائی کیوں نہیں۔
لڑکا: ضرورت ہی نہیں پڑی تھی، پر آج جیب خالی ہے۔

ماسٹر: لڑکو! بتاؤ لکڑی پانی میں کیوں نہیں ڈوبتی؟
ایک لڑکا: جناب لکڑی پانی میں تیرنا جانتی ہے۔

محمد سلیم۔ کراچی

پہاڑ کیسے بنے؟

قدسیہ عبید



گرمیوں کا موسم تھا۔ کراچی کی گرمی سے گھبرا کر ابّو میاں نے پہاڑوں پر جانے کا فیصلہ کیا۔ امّی سے کہا کہ وہ پہاڑوں پر چلنے کی تیاری کرلیں۔ اس خبر سے رشید، حمید اور خالدہ تو بہت خوش تھے، لیکن ننّھا جاوید سخت ناراض تھا۔ وجہ یہ تھی کہ جاوید میاں کو یہ فکر تھی کہ اگر وہ پہاڑوں پر چلے گئے تو ان کا دوست عادل ان سے چھوٹ جائے گا۔ انھیں یہ بھی اطمینان تھا کہ اگر ابّو میاں سے انھوں نے ضد کی تو وہ ضرور جاوید کی بات مان لیں گے۔ اگر اس کے باوجود بھی ابّو میاں نے ان کی بات نہ سنی تو وہ رو دھو کر اپنی بات منوالیں گے۔ اس خیال کے آتے ہی انھوں نے فیصلہ کیا کہ ابّو میاں شام کو کھانا کھانے کے بعد جب بڑے والے کمرے میں بیٹھیں گے تو وہ ابّو میاں سے ضرور فرمائش کریں گے۔

دن بھر تو جاوید میاں اپنے ننّھے دوست عادل کے ساتھ کھیلتے رہے۔ شام کو جب سب لوگ کھانا کھا چکے اور ابّو میاں بڑے کمرے میں بیٹھ گئے تو جاوید میاں کو خیال آگیا کہ انھیں

ابّو سے کوئی فرمائش کرنی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ فوراً ابو میاں کے پاس پہنچے اور کہنے لگے،

"ابو میاں، ہم پہاڑوں پر نہیں جائیں گے۔"

"وہ کیوں بیٹے؟" ابو میاں نے پوچھا۔

"عادل بھی تو نہیں جا رہا ہے وہاں۔" جاوید نے کہا۔

"تو کیا ہوا؟" ابو میاں نے کہا۔

"پھر ہم وہاں کھیلیں گے کس کے ساتھ؟" عادل میاں نے اصل مقصد سمجھایا۔

"بھئی وہاں اور بھی بہت سے بچّے ہوں گے، ہرے بھرے باغ ہوں گے۔ خوب صورت جنگل ہوں گے اور بہت سی نئی نئی چیزیں ہوں گی۔ تم ان کے ساتھ کھیلنا۔" ابو میاں نے سمجھایا۔

اِتنی بہت سی چیزوں کا نام سن کر جاوید میاں کے دل میں ان سب چیزوں کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا، کیوں کہ انھوں نے اس سے پہلے ان میں سے کوئی چیز نہ دیکھی تھی۔ ابھی عمر ہی کیا تھی اُن کی۔ مشکل سے چار سال کے ہوں گے بے چارے۔ اب جاوید میاں ایک طرف تو یہ سوچ رہے تھے کہ یہ سب چیزیں ضرور دیکھنی چاہییں، لیکن وہ عادل کو بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے، اس لیے انھوں نے کہا،

"تو پھر عادل کو بھی لے چلیے۔"

"لیکن عادل کی امّی تو اُسے نہیں بھیجیں گی۔" ابو میاں نے بتایا۔

یہ واقعی ٹیڑھا معاملہ تھا۔ جاوید کو فوراً ہی ایک نئی بات سوجھی کہنے لگے،

"تو پھر پہاڑوں کو یہیں منگوا لیجیے۔"

انھیں کیا معلوم تھا کہ پہاڑ کیسے ہوتے ہیں، اس لیے انھوں نے یہ جملہ کہہ دیا تھا۔ ابّو کو اس جملے پر ہنسی آگئی، لیکن انھوں نے جاوید کو سمجھایا کہ پہاڑ ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں لے جائے جا سکتے۔ وہ صرف ایک ہی جگہ رہتے ہیں۔ اب جاوید کو فوراً ہی دوسری ترکیب سوجھی، کہنے لگے،

"اگر وہاں سے پہاڑ نہیں آسکتے تو آپ یہیں دوسرے پہاڑ بنوا لیجیے۔"

اسی وقت رشید، حمید اور خالدہ

بھی بڑے کمرے میں آگئے تھے۔ حمید نے جاوید کا جملہ سنتے ہی کہا،

"کہیں پہاڑ بنائے جاسکتے ہیں؟"

"ہاں ہاں ابو بنوا سکتے ہیں۔ ابّو نے اطہر بھائی کے بنگلے کی طرح دوسرا بنگلہ بنوا لیا ہے تو وہ پہاڑ بھی بنوالیں گے۔"

جاوید نے اطہر بھائی کے بنگلے کی مثال دیتے ہوئے اپنی بات ثابت کرنے کی کوشش کی، لیکن سب لوگ اب ان کی بات پر ہنس رہے تھے۔

اس موقع پر ابّو میاں نے کہا،

"بھئی جاوید کو دراصل یہ معلوم ہی نہیں کہ پہاڑ ہوتے کیسے ہیں؟ ہم ابھی انھیں پہاڑوں کی تصویر دکھا کر سب سمجھا دیں گے۔" پھر ابّو جان اپنی میز سے اپنی البم لے آئے اور اس میں سے کئی پہاڑوں کی تصویریں جاوید کو دکھائیں۔ دوسرے بچّے بھی غور سے یہ تصویریں دیکھ رہے تھے۔ تصویریں دیکھتے دیکھتے رشید نے ابّو سے پوچھا،

"ابّو جان، ہمیں ایک اور بات سمجھا دیجئے۔"

"ضرور پوچھو۔" ابّو نے کہا۔

"سب سے پہلے پہاڑ دنیا میں بنے کس طرح ہیں؟" رشید نے پوچھا۔

رشید تو آٹھویں جماعت میں پڑھ رہا تھا، اس لیے یہ سوال کر بیٹھا، لیکن جاوید اور خالدہ کو اس سے کیا دل چسپی ہوسکتی تھی، اس لیے وہ دونوں تو ابّو کی البم لے کر پہاڑوں کی تصویریں دیکھنے کے لیے ایک طرف بیٹھ گئے اور ابّو نے رشید کو سمجھانا شروع کیا، "پہاڑوں کے متعلق مختلف سائنس دانوں کا مختلف خیال ہے، لیکن زیادہ تر سائنس داں یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ آج سے کئی کروڑ سال پہلے، جب ہماری دنیا تھی، نہ چاند تارے، اس وقت پوری کائنات میں آگ کا ایک بہت بڑا گولہ تھا، جسے سحابیہ کہتے تھے۔ یہ سحابیہ اپنی جگہ پر گردش کر رہا تھا گھومتے گھومتے یہ پھیلنے لگا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ ان میں سے ایک ٹکڑا سورج تھا۔ سورج بھی اپنی جگہ گھومتا رہا اور گھومتے گھومتے اس کے بھی آٹھ ٹکڑے ٹوٹ کر اس سے الگ ہوگئے۔ ان آٹھ ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا زمین بھی ہے۔ سورج کی طرح زمین بھی شروع شروع میں بہت زیادہ گرم تھی۔ آگ کا

ایک بہت بڑا ٹکڑا۔ یہ بھی اپنی جگہ گھوم رہی تھی۔ گھومتے گھومتے یہ آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہونا شروع ہوگئی۔ اسی زمانے میں زمین کی یہ سخت سطح بنی، جس پر ہم آج چلتے پھرتے اور اپنے مکان بناتے ہیں اور یہ سطح اس طرح بنی کہ پہلے تو پوری زمین گرمی کی وجہ سے پگھلے ہوئے لاوے کی مانند تھی، پھر یہ لاوا ٹھنڈا ہوکر گاڑھا ہونے لگا اور پھر گاڑھا ہوتے ہوتے جم گیا۔ یہ نظریہ پیش کرنے والے سائنس دانوں کا نام ایلی ڈی بیو مانٹ اور جیمس ڈانا تھا۔ پھر جب زمین کی سطح سخت اور سطح کے نیچے کا حصّہ گاڑھا ہوگیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نچلا حصّہ بھی ٹھنڈا ہوکر سکڑنے لگا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب نیچے کا حصّہ سکڑنے لگا تو زمین میں دراڑیں پڑگئیں۔ سطح کے نیچے کھنچاؤ پیدا ہونے کی وجہ سے یہ دراڑیں پڑی تھیں اور ان دراڑوں کی وجہ سے زمین کی اوپری سطح کو بھی سکڑنا پڑا۔ اوپر کی سطح چوں کہ سخت ہوچکی تھی، اس لیے یہ سکڑ کر بعض جگہ سے اوپر اٹھ گئی۔ تم نے سوکھی ہوئی سبزیاں تو ضرور دیکھی ہوں گی، خاص طور پر بینگن وغیرہ یا پھر چھوارے دیکھے ہوں گے؟"

"جی ہاں دیکھے ہیں۔" رشید نے کہا۔

"جب یہ سوکھ جاتے ہیں تو ان پر جھرّیاں پڑجاتی ہیں، ان کا چھلکا بعض جگہ سے اوپر اٹھ آتا ہے اور بعض جگہ گڑھے سے پڑجاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح زمین کی سطح بھی کہیں سے دب گئی اور بعض جگہ سے اوپر اٹھ گئی۔ جو جگہ اوپر اٹھی تھی، اسی کو پہاڑوں کا نام دیا گیا۔

اب ذرا افریقہ اور جنوبی امریکا کا نقشہ دیکھو تو معلوم ہوگا کہ جنوبی امریکا کا مشرقی ساحل اور افریقہ کا مشرقی ساحل تقریباً یکساں ہے۔ اِسی یکسانیت کو دیکھ کر ۱۹۲۹ء میں ڈوٹا بیٹ اور ویگیز نامی سائنس دانوں نے دراڑیں پڑنے کا اصول ثابت کیا، حالاں کہ سب سے پہلے یہ نظریہ ایک فرانسیسی سائنس داں اور فلسفی اینٹو نیو اسنیڈر نے اپنی کتاب میں پیش کیا تھا۔ اس سائنس داں نے اپنی کتاب میں بتایا تھا کہ دنیا کے تمام برّاعظم تقریباً دو ارب سال پہلے تک ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے اِن

تمام برّاعظموں کو اس سائنس داں نے پانگی کا نام دیا تھا۔ ان کے ساتھ ایک بہت بڑا سمندر بھی تھا، جو اس پانگی کو گھیرے ہوئے تھا۔ سائنس داں نے اس سمندر کا نام ٹیتھس رکھا تھا۔ پھر جب زمین کی سطح کے نیچے کا حصّہ سکڑ کر چھوٹا ہوگیا اور زمین میں دراڑیں پڑنے لگیں تو یہ تمام براعظم ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔ زمین کے بعض حصّے تو قطب شمالی کی طرف سکڑ گئے، جس کی وجہ سے ہندستان کا ملک علیحدہ ہوگیا، جس کے ایک حصّے پر، ہم نے پاکستان کے نام سے نیا ملک بنا لیا۔ اس طرح دراڑیں پڑنے کے عمل کو لوگوں نے گرین لینڈ اور کنیڈا کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلے سے بھی ثابت کیا ہے۔"

"ابو جان، تو ایک بات اور بتا دیجیے۔ یہاں تک تو ہم سیکھ چکے" رشید نے کہا۔

"ابھی تھوڑے دن پہلے ہم نے کسی سے سُنا تھا کہ ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ، جو پہلے ۲۹ ہزار فیٹ اونچی تھی، اب ۲۹ ہزار ۲ فیٹ اونچی ہوگئی ہے، تو ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟"

"بہت خوب، سوال بہت اچھا ہے!" ابّو نے کہا، "ہماری زمین کی سطح سے تقریبًا ۳ میل کی گہرائی پر زمین ابھی تک گرم ہے اور رفتہ رفتہ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ وہ جتنی ٹھنڈی ہو کر سُکڑتی ہے اتنا ہی پہاڑوں کی بلندیاں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بتا دیں کہ ہمالیہ پہاڑ اور ایلپس کے پہاڑ دنیا میں بالکل نئے ہیں۔"

"نئے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟" رشید نے پوچھا۔

"مطلب یہ ہے کہ بارش، برف باری، دریاؤں کی رَوانی کی وجہ سے پہاڑوں کی مٹی ہمیشہ کٹتی رہتی ہے اور اسی وجہ سے دنیا میں بہت سے پہاڑ غائب ہوگئے ہیں، لیکن دوسری طرف زمین کے سُکڑنے کی وجہ سے نئے پہاڑ بنتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ شروع سے جاری ہے۔ سائنس دانوں

کا خیال ہے کہ ہماری زمین کے موجودہ پہاڑوں سے پہلے تین مرتبہ اور بھی پہاڑ بنے اور مٹ گئے۔ چوتھی مرتبہ ہمالیہ اور ایلپس کے پہاڑ بنے ہیں۔"

رشید پوری طرح ابّو کی بات سمجھ چکا تھا اور جاوید میاں تو البم میں ایسے مگن ہوئے تھے کہ پہاڑ پر نہ جانے کی ضد ہی بھول گئے تھے۔ ابّو کی البم دیکھتے دیکھتے اس وقت وہ اونگھ رہے تھے، چناں چہ ابّو نے جاوید میاں کو اٹھا کر پلنگ پر لٹایا اور دوسرے بچّوں کو بھی سونے کی ہدایت کر کے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

★

باپ: بیٹا تم اس اٹھنّی کو کیوں توڑ رہے ہو؟

بیٹا: امّی جان نے کہا تھا کہ اس میں سے آدھے پیسے تمھارے اور آدھے پیسے بھائی جان کے ہیں، اس لیے توڑ رہا ہوں کہ آدھی اٹھنّی بھائی جان کو دے دوں۔

★

ایک شخص: (اسٹیشن ماسٹر سے) جناب، میں گاڑی پر جانا چاہتا ہوں۔

اسٹیشن ماسٹر: جاؤ، میں نے تمھیں روکا تو نہیں۔

شخص: جناب ٹکٹ دیجیے۔

اسٹیشن ماسٹر: کہاں کا ٹکٹ دوں؟

شخص: جہاں مجھے جانا ہے۔

★

★

ڈاکٹر: (مریض سے) اب کیا حال ہے؟

مریض: حال تو اچھا ہے، مگر سانس رک رک کر آتا ہے۔

ڈاکٹر: کوئی فکر نہ کیجیے، سانس بھی بند کر دیتا ہوں۔

(مقصود احمد مجاہد)

★

استاد: (شاگرد سے) بتاؤ سب سے زیادہ دودھ کون سا جانور دیتا ہے؟

شاگرد: جناب، حلوائی۔

★

مجسٹریٹ: تمھیں شرم نہ آئی کہ تم نے کوئلہ بلیک کیا۔

ملزم: جناب آپ غلط کہتے ہیں، کوئلہ تو پہلے ہی بلیک ہے۔ (قیصر محمود غازی)



چاندنی

عبدالحمید نظامی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی گاؤں میں ایک گوالا رہتا تھا۔ اس کی دو بیویاں تھیں۔ پہلی بیوی کے اولاد نہیں ہوتی تھی، اس لیے اس نے دوسری شادی کی تھی۔ اس دوسری بیوی کے ایک بچّی پیدا ہوئی، جو بہت ہی خوب صورت تھی۔ گوالا بچّی کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس کا نام چندو رکھا، کیوں کہ وہ چاند جیسی پیاری اور دل کش تھی۔

چندو کے ماں باپ اس پر جان چھڑکتے اور ہر وقت اس سے دل بہلاتے۔ وہ اپنی پیاری پیاری توتلی باتوں سے انھیں ہنساتی، مگر گوالے کی پہلی بیوی کو

چندو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ چندو کی ماں سے جلتی تھی۔ انھیں ہنسی خوشی دیکھ کر اسے اور بھی زیادہ حسد ہوتا۔ رفتہ رفتہ وہ چندو کی جان کی دشمن ہوگئی۔

چندو کی ماں تو گھر کے کام کاج کیا کرتی اور گوالے کی پہلی بیوی دودھ بیچنے شہر جایا کرتی۔ ایک دن جب وہ دودھ کے برتن سر پر رکھ کر شہر جانے لگی تو چندو گھر میں اکیلی تھی۔ اس کی ماں پانی بھرنے کنویں پر گئی ہوئی تھی۔ گوالے کی بیوی نے موقع پاکر چندو کو گود میں اٹھا لیا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ اس نے دل میں سوچا "اسے جنگل میں چھوڑ دوں گی۔ رات کو جنگلی درندے اسے کھا جائیں گے یا بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر خود مر جائے گی۔" چلتے چلتے جب وہ جنگل بیابان میں پہنچی تو اس نے چندو کو گود سے اتار دیا اور اسے اکیلا چھوڑ کر آگے چلی گئی۔ اس ظالم عورت کو اس معصوم پر ذرا بھی ترس نہ آیا اور اس نے ایک بار بھی مڑ کر پیچھے نہ دیکھا۔

دو ڈھائی سال کی ننھی سی جان سنسان جنگل میں بھٹکتی پھرنے لگی۔ جھاڑیوں میں الجھ کر اس کے کپڑے پھٹ گئے۔ گرنے سے جگہ جگہ چوٹیں لگ گئیں اور سر سے خون بہنے لگا۔ نازک نازک پھول جیسے پیروں میں کانٹے چبھ گئے۔ وہ تکلیف اور درد سے بلبلاتی اور چلاتی رہی، مگر دور دور آدمی یا آدم زاد کا پتہ نہ تھا۔ اس کی فریاد کون سنتا۔ جس وقت وہ روتے ہوئے اماں! اماں! پکار رہی تھی، آسمان پر دو رحم دل پریاں اڑتی جا رہی تھیں۔ ان کی نگاہ نیچے بچی پر پڑی۔ انھیں اس کی حالت پر بہت ترس آیا۔ ایک بولی، "ارے ہائے! کیسی پیاری بچی ہے۔ نہ جانے ماں باپ سے بچھڑ گئی یا کوئی ظالم یہاں چھوڑ گیا ہے۔" دوسری نے جواب دیا، "ہمیں اس کی ضرور مدد کرنی چاہیے۔ ورنہ بچاری کو جنگلی جانور کھا جائیں گے۔" یہ کہہ کر دونوں پریاں چندو کے پاس آئیں۔ اسے پیار کیا اور اس کے گھر کا پتہ پوچھا۔ چندو ننھی سی تو تھی، وہ

گھر کا پتہ کیا بتاتی، بس 'اماں، اماں' کہہ کر روتی رہی۔

پریاں اس کے رونے سے پریشان ہوگئیں۔ وہ اسے پرستان نہیں لے جاسکتی تھیں، کیوں کہ وہ آدم زاد تھی۔ آخر آپس میں مشورہ کرکے انھوں نے فیصلہ کیا کہ کسی اونچے سے درخت پر اس کا گھر بنادیں، تاکہ وہ جنگلی جانوروں سے محفوظ ہوجائے اور اگر اس کے ماں باپ اس کی تلاش میں آئیں تو انھیں یہ مل بھی جائے۔ یہ فیصلہ کرکے انھوں نے ایک بہت بڑے درخت پر لوہے کا ایک پنجرہ بنا دیا۔ اس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور اس کے سات دروازے تھے۔ انھوں نے بچی کو اس میں ڈال دیا اور سوچ سوچ کر اس کا نام "چاندنی" رکھا، کیوں کہ وہ بہت ہی خوب صورت تھی۔

ان نیک پریوں کو چاندنی سے بے حد محبت ہوگئی۔ وہ اس کے کھانے کے لیے اچھی اچھی چیزیں لاتیں اور اس کا ہر طرح خیال رکھتیں۔ جب چاندنی کی عمر بارہ برس ہوگئی تو وہ اس کے لیے شہزادیوں جیسے زرق برق ریشمی کپڑے، جگ مگ جگ مگ کرتے ہیرے جواہرات جڑے ہوئے زیورات اور اچھے اچھے کھلونے لائیں۔ ایک پری بولی، "بہن ہمیں چاہیے کہ چاندنی کے لیے ہیرے کی انگوٹھی بھی لائیں۔" دوسری پری نے خوش ہوکر جواب دیا، "ہاں تب تو یہ بالکل شہزادی نظر آئے گی، مگر اس کے لیے ہمیں بہت دور دراز کا سفر کرنا پڑے گا۔ سب سے بہترین انگوٹھی کوہ قاف میں دیووں کے بادشاہ کے پاس ہے اور وہاں آنے جانے میں ایک سال لگ جائے گا۔"

انھوں نے سفر پر جانے سے پہلے بہت سارا کھانے پینے کا سامان پنجرے میں جمع کر دیا۔ وہ ایک کتا اور بلی بھی کہیں سے اٹھا لائیں، تاکہ چاندنی کا دل بہلا رہے۔ یہ انتظام کرکے وہ دور بہت دور اڑ گئیں۔

اب چاندنی بالکل اکیلی رہ گئی، مگر وہ بہت خوش تھی۔ اس کے پاس

کتا اور بلی کھیلنے کے لیے تھے۔ پنجرے میں آگ بھی جلی ہوئی تھی، تاکہ گرمائی رہے۔ وہ اسی پر کھانا پکاتی اور آگ کو کبھی بجھنے نہ دیتی، مگر ایک دن بلی نے کھانا چرا کر کھا لیا۔ چاندنی نے اس سے کہا، "تم بہت بری بلی ہو۔ تمھیں چوری نہیں کرنا چاہیے تھی۔" اور یہ کہہ کر اسے ایک چھڑی ماری۔

بلی کو بہت غصہ آیا۔ وہ بڑبڑائی، "مجھے چوری کیوں نہیں کرنی چاہیے۔ چوری کرنا تو میری عادت ہے اور مجھے پسند بھی ہے۔ مالکہ نے اتنی سی بات پر مجھے مارا ہے، میں اس کی آگ بجھا دوں گی۔" یہ ارادہ کرکے وہ دوڑتی ہوئی آگ کے پاس گئی اور آگ بجھا دی۔ جب چاندنی نے یہ دیکھا تو وہ بہت ناراض ہوئی اور سوچنے لگی کہ اب وہ آگ کیسے جلائے گی؟ آگ نہ جلی تو کھانا کیسے پکائے گی؟ وہ بہت سوچتی رہی۔ سارا دن گزر گیا۔ وہ کچھ بھی نہ کھا سکی۔ کتا اور بلی بھی اس کے ساتھ بھوکے رہے۔ اب تو بلی بہت پچھتائی کہ اس نے آگ کیوں بجھائی۔ اب دوبارہ آگ کیسے جلے گی۔

آخر چاندنی پنجرے کے سرے پر آئی اور اِدھر اُدھر نگاہ دوڑانے لگی۔ بہت دور اسے دھواں اٹھتا دکھائی دیا۔ وہ پنجرے سے نکلی اور درخت سے اتر کر اس طرف چل دی جدھر دھواں اٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔

چاندنی بہت دیر تک چلتی رہی۔ آخر چلتے چلتے وہ ایک جھونپڑی کے دروازے پر پہنچی۔ اس جھونپڑی میں ایک ضعیف بڑھیا بیٹھی آگ تاپ رہی تھی۔ یہ بڑھیا دراصل دیونی تھی اور اس جھونپڑی میں اپنے بیٹے کے ساتھ رہتی تھی۔ جوں ہی بڑھیا کی نگاہ چاندنی پر پڑی، اس کے منھ میں پانی بھر آیا۔ وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے دل ہی دل میں بڑبڑائی "آہا کیسی حسین لڑکی ہے! کاش میرا بیٹا موجود ہوتا! خیر میں کوشش کروں گی کہ اس کے

آنے تک اسے روکے رہوں۔" دل ہی دل میں یہ باتیں سوچ کر وہ چاندنی سے بولی "آؤ بیٹی آؤ! تم کون ہو؟ اور کیا چاہتی ہو؟"

چاندنی نے جواب دیا "میں پریوں کی بیٹی ہوں۔ وہ کوہ قاف سے میرے لیے ہیرے کی انگوٹھی لینے گئی ہیں۔ میں پنجرے میں اکیلی ہوں۔ میری آگ بجھ گئی ہے اور میں اسے دوبارہ نہیں جلا سکتی۔ مہربانی کرکے تم اپنے چولھے میں سے تھوڑی سی آگ دے دو۔" دیونی بولی "میری ننھی بچّی! میں تمھیں آگ دے دوں گی، مگر تم بھی میرا تھوڑا سا کام کرتی جاؤ۔ میں بہت بوڑھی ہوں۔ مجھ سے کام نہیں ہوتا۔ مٹکی میں جو چاول ہیں، وہ ذرا چکّی میں پیس دو۔"

چاندنی اسی وقت چکّی چلانے بیٹھ گئی۔ ذرا سی دیر میں سارے چاول پیس دیے اور کہا، "بڑی امّاں، اب تو مجھے آگ دے دو۔ میں جلدی سے واپس چلی جاؤں۔"

دیونی پیار سے بولی "ابھی ذرا ٹھیر جاؤ۔ یہ ذرا سے گیہوں ہیں، انھیں بھی پیس ڈالو۔ اللہ تمھارا بھلا کرے گا" چاندنی نے کہا "بہت اچھا امّاں، یہ بھی پیس دیتی ہوں۔" یہ کہہ کر چاندنی نے سارے گیہوں پیس ڈالے اور پھر کہا، "اب تو آگ دے دو اور مجھے جانے دو۔" دیونی نے محبّت سے جواب دیا "ابھی رک جاؤ میری بچّی! دیکھو تو میرا گھر کتنا گندہ ہو رہا ہے۔ تم ماشاءاللہ جوان اور تن درست ہو۔ ذرا جلدی جلدی اس کی صفائی بھی کر دو۔ اللہ تمھاری عمر دراز کرے۔" چاندنی نے بڑھیا کے گھر میں جھاڑو دے دی اور ہر چیز جھاڑ پونچھ کر صاف ستھری کر دی۔

دیونی کی آنکھیں راستے پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ دل ہی دل میں کہنے لگی، "اب تک میرے بیٹے کو آجانا چاہیے تھا۔ آج پتہ نہیں اسے اتنی دیر کیوں ہوگئی"۔ چاندنی نے کہا، "بڑی بی! اب تو میں نے تمھارا سارا کام کر دیا۔ مجھے تھوڑی سی آگ

دے دو۔" دیونی جلدی سے بولی،" تم جیتی رہو بیٹی! بس ایک کام اور رہ گیا ہے، وہ کر دو اور آگ لے کر چلی جانا۔ یہ قریب ہی کنواں ہے، وہاں سے ایک ڈول پانی بھر کر لادو۔"

چاندنی کنویں سے پانی بھی بھر لائی اور جھلا کر بولی،" مائی جی، مجھے بہت دیر ہو گئی۔ اب میں ضرور جاؤں گی۔ اگر تمھیں آگ نہیں دینی تو میں کہیں اور سے لے لوں گی۔" دیونی نے دُعائیں دیتے ہوئے کہا،" تمھاری بڑی مہربانی ہے بیٹی! تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ آگ لے لو اور چلی جاؤ۔ یہ تھوڑا سا بھس ہے۔ یہ بھی لیتی جاؤ۔ اسے راستے میں گراتی چلی جانا اور اپنے گھر تک ختم کر دینا۔ اِس طرح تمھیں اکیلے میں ڈر نہیں لگے گا اور راستہ بھی آسانی سے کٹ جائے گا۔" یہ کہتے ہوئے دیونی نے بھُس کا تھیلا چاندنی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ چاندنی نے تھوڑی سی آگ لی اور جھونپڑی سے چل دی۔ چلتے ہوئے وہ راستے میں بھُوسے کے تنکے گراتی گئی، جس سے اس کے پیچھے ایک لکیر سی بنتی چلی گئی، حتیٰ کہ وہ درخت پر چڑھ گئی اور پنجرے میں پہنچ کر لوہے کے ساتوں دروازے بند کر لیے۔ پھر اس نے آگ جلائی اور کھانا پکایا۔ پہلے کتے اور بلی کو کھلایا، پھر خود کھایا۔

چاندنی کو دیونی کی جھونپڑی سے نکلے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ دیو کا بیٹا آگیا۔ دیونی نے غصّے سے پوچھا،" تم اتنی دیر سے کیوں آئے ہو؟ آج ایک جوان اور خوب صورت لڑکی یہاں آئی تھی۔ میں نے اسے تمھارے آنے تک روکنے کی کوشش کی، مگر تم نے بہت دیر لگا دی۔"

دیونی کے بیٹے نے جلدی سے پوچھا،" اچھی اماں، جلدی بتاؤ، وہ کس طرف گئی ہے۔ میں اسے راستے ہی میں جا پکڑوں گا۔" چالاک دیونی نے پگڈنڈی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا،" اس بھوسے کو دیکھتے ہوئے چلے جاؤ، تمھیں اس کا ٹھکانہ معلوم ہو جائے گا۔"

جوان دیو جلدی جلدی اُدھر

جانے لگا، جو چاندنی بھوسے کے تنکے بکھیرتی ہوئی گئی تھی۔ درخت کے نیچے جاکر یہ تنکے ختم ہو گئے تھے۔ دیو نے پہلے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی، پھر سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ بہت اونچائی پر اسے لوہے کا ایک پنجرہ دکھائی دیا۔ وہ درخت پر چڑھ گیا اور پنجرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ دیو اپنی آواز بدل کر بولا "میری بچی دروازہ کھولو۔ میں پری ہوں، تمھارے لیے کوہ قاف سے ہیرے کی انگوٹھی لائی ہوں"۔ مگر چاندنی بہت گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ دیو کی آواز نہ سن سکی۔ دیو نے غصّے میں آکر بہت زور لگایا اور دروازہ توڑنے کی کوشش کی، مگر دروازہ بہت مضبُوط لوہے کا بنا ہوا تھا۔ دیو نے اتنا زور لگایا کہ اس کی انگلی کا ایک ناخن ٹوٹ گیا اور وہ ناخن ٹوٹ کر دروازے کی ایک درز میں پھنس گیا۔ دیو کا ناخن شیر کے ناخن سے بھی بڑا تھا۔ یہ خنجر کی طرح نوکیلا اور زہر آلود تھا۔

صبح ہوئی تو چاندنی سو کر اُٹھی اور پنجرے کے دروازے کھولنے لگی۔ جب وہ ساتواں دَروازہ کھول رہی تھی تو دیو کا ناخن اس کی ہتھیلی میں



چبھ گیا۔ زہر ایک دم اس کے بدن میں پھیل گیا اور وہ مُردوں کی طرح گر پڑی۔ اسی صبح دونوں نیک پریاں واپس پہنچیں۔ انھوں نے چاندنی کو پنجرے کے کنارے پر بے سُدھ پڑے دیکھا۔ اس کا جسم بالکل ٹھنڈا تھا اور وہ مُردہ معلوم ہوتی تھی۔ نرم دل پریوں کو چاندنی کے مرنے کا بے حد صدمہ ہوا۔ ہیرے کی جو انگوٹھی وہ بڑی مشکل سے لائی تھیں، اس کی انگلی میں پہنا دی اور آنسو بہاتی پرستان کی طرف اُڑ گئیں۔

تھوڑی دیر بعد کا ذکر ہے کہ ایک نوجوان بادشاہ شکار کھیلتا ہوا وہاں پہنچا۔ اس کے ساتھ پیادے اور شکاری جانور تھے۔ اس نے اسی درخت کے نیچے خیمہ لگانے کا حکم دیا۔ یونہی اس کی نگاہ اوپر اٹھ گئی۔ شاخوں میں اسے ایک چھوٹا سا خوب صورت گھر نظر آیا۔ اس نے ایک پیادے کو حکم دیا، "فوراً اس درخت پر چڑھ جاؤ اور دیکھو یہ پنجرہ کیسا ہے؟" بادشاہ کا حکم پاتے ہی پیادہ تیزی سے درخت پر چڑھ گیا اور پھر واپس آکر کہنے لگا، "جہاں پناہ! یہ ایک لوہے کا پنجرہ ہے۔ اس میں سات دروازے ہیں۔ اس کے فرش پر ایک بہت حسین لڑکی مُردہ پڑی ہے۔ اس کا لباس بہت شان دار ہے۔ اس نے بڑے خوب صورت زیورات پہنے ہوئے ہیں اور اس کے پاس ایک کتا اور ایک بلی بیٹھے ہوئے ہیں۔"

بادشاہ یہ بات سن کر بہت حیران ہوا اور اس کے دل میں چاندنی کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے پیادوں کو حکم دیا، "اس لڑکی کو اسی وقت نیچے لایا جائے۔" پیادوں نے حکم کی تعمیل کی اور چاندنی کو بڑے آرام سے اتار کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے چاندنی کو دیکھا تو اُسے مُردہ سمجھ کر بہت رنج ہوا۔ اس نے چاندنی کا ہاتھ پکڑ کر دیکھا۔ وہ بالکل سرد تھا، مگر نبض چل رہی

تھی۔ وہ فوراً بول اٹھا،" یہ مُردہ نہیں ہے۔" اچانک اس کی نگاہ چاندنی کی ہتھیلی میں چُبھے ہوئے دیو کے ناخن پر پڑگئی۔ بادشاہ نے وہ ناخن کھینچ کر نکال دیا۔ ناخن ہتھیلی سے نکلتے ہی چاندنی اٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنی آنکھیں مَل کر حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس نے پوچھا، "مَیں کہاں ہوں؟ بتاؤ میں کہاں ہوں؟ کیا مَیں خواب دیکھ رہی ہوں؟"

بادشاہ نے مسکرا کر جواب دیا،" اے خوب صورت لڑکی! تم خواب نہیں دیکھ رہی ہو۔ میں اس ملک کا بادشاہ ہوں۔ میرے پیادے تمھیں اس درخت کے گھر میں سے نکال کر لائے ہیں۔ اب تم بتاؤ کہ تم کون ہو؟"

چاندنی نے کہا، "مَیں پریوں کی بیٹی ہوں۔" بادشاہ خوش ہوکر بولا، "واقعی تم پریوں کی شہزادی ہو۔" چاندنی سر ہلا کر بولی، "نہیں حضور، میں شہزادی نہیں ہوں۔ میں پریوں کی بیٹی ہوں۔ بچپن سے اِسی گھر میں پرورش پارہی ہوں۔ میرا نام چاندنی ہے۔"

یہ سن کر بادشاہ نے کہا، "تم چاندنی سے بھی زیادہ حسین ہو۔ اگر سچ مچ شہزادی نہیں ہو تو مَیں تمھیں شہزادی بنا سکتا ہوں۔ چاندنی تم میری ملکہ بن جاؤ۔"

چاندنی نے شرما کر سر جھکا لیا۔ نوجوان بادشاہ اُسے اپنے ہمراہ محل میں لے گیا، جہاں چند روز بعد بڑی شان و شوکت کے ساتھ ان کی شادی ہوگئی۔ بادشاہ کی ماں، بہنوں اور رعیّت نے چاندنی کو بہت پسند کیا۔

اب چاندنی ملکہ تھی، مگر بادشاہ کی ایک ملکہ پہلے ہی تھی۔

(اس دل چسپ کہانی کا دوسرا ٹکڑا آئندہ مہینے پڑھو۔)

کچھ کہو کچھ سُنو

پرویز اقبال کاشمیری - قائد آباد

س : ایک ڈویژن میں کتنی فوج ہوتی ہے؟

ج : پندرہ ہزار سے زیادہ سپاہی ہوتے ہیں۔

سلیم شمس الدین - کراچی

س : ہمدرد نونہال ہر ماہ کس تاریخ کو شائع ہوتا ہے ؟

ج : ہر مہینے کی ۲۲ تاریخ تک بازار میں آجاتا ہے۔

حسن محمود - مظفر گڈھ

س : کیا نونہال غیر ممالک میں بھی جاتا ہے؟

ج : غیر ملکی نونہال ، نونہال کو بڑی دل چسپی سے پڑھتے ہیں۔

رضوان احمد - تاندلیانوالہ

س : دنیا کی سب سے قیمتی چیز کون سی ہے ؟

ج : دنیا کی سب سے قیمتی چیز علم ہے۔

جمیل الدین شیخ - حیدر آباد

س : قائد اعظم محمد علی جناح کی وفات کو کتنا عرصہ گزر گیا ؟

ج : قائد اعظم کی وفات کو ۱۷ سال گزر گئے۔ قائد اعظم ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو اللہ کو پیارے ہوئے تھے۔

تحسین اصغر - واہ کینٹ

س : بھائی جان، آپ نونہال کا سالنامہ کیوں نہیں شائع کرتے ؟

ج : اس لیے کہ نونہال کا ہر شمارہ سال نامے جیسا ہوتا ہے۔

محمد ریاض الدین اختر - ڈھاکہ

س : بھائی جان ، نونہال کی تاریخ پیدائش لکھیے۔

ج : سن انیس سو چوّن ۱۹۵۴ء

سلیمان احمد - کراچی

س : زندگی میں سب سے ضروری چیز ؟

ج : صحت ــــ جس کے بغیر آدمی کوئی کام نہیں کر سکتا۔

مختار الزّماں انصاری ۔میمن سنگھ

س : چینی زبان سیکھنے کی کوئی صورت بتائیے ؟

ج : چینی زیادہ کھانا چھوڑ دو اور کسی چینی بھائی سے مشورہ کرو۔

محمد اکرم بلوچ ۔ پسنی

س : پاکستان کے آخری وزیرِ اعظم کون تھے اور انھوں نے کتنے عرصے حکومت کی ؟

ج : فیروز خاں نون، چند مہینے ۔

احمد بشیر اچلانہ ۔ پشاور

س : کیا آپ مضامین چھاپنے کے بدلے معاوضہ لیتے ہیں ؟

ج : نہیں تو، ہم نونہالوں کی اچھی اور مزے دار کہانیاں، مضامین، بِلا مُعاوضہ لیے چھاپتے ہیں اور بڑے ادیبوں کو ان کے مضامین کا معاوضہ خود پیش کرتے ہیں۔

میمن کمار۔ کراچی

س : انسان کی زندگی کیا ہے ؟

ج : اِمتحان ہے، جس میں وہی پورا اترتا ہے، جو خدمتِ خلق کرتا رہے۔

سلیم الدّین فصیحی ۔ لائل پور

س : کیا آپ نونہال کے علاوہ اور بھی کوئی رسالہ نکالتے ہیں ؟

ج : ادارۂ ہمدرد سے نونہال، ہمدرد صحت اخبار الطِبّ، خبرنامہ اردو میں اور ہمدرد میڈیکل ڈائجسٹ، ہمدرد میڈیکل ٹائمز انگریزی میں نکلتے ہیں ۔

سیّد بابر علی واحدی ۔ کراچی

س : دنیا کا طاقت ور پہلوان ؟

ج : کیوں کشتی کا چیلنج دینا ہے؟ سب سے بڑا پہلوان وہ ہے، جو کم زوروں کی حمایت اور چھوٹوں کی حفاظت کرے۔

سہیل اکبر۔ کراچی

س : پاکستان کا سب سے بڑا شہر کون سا ہے ؟

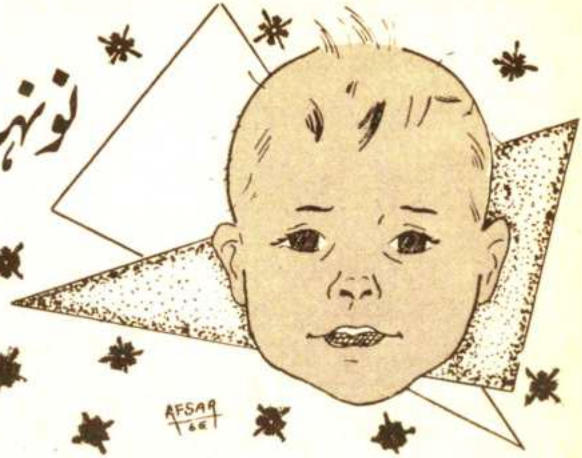
ج : کراچی پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے، جہاں تم رہتے ہو اور جہاں سے "نونہال" نکلتا ہے۔

ارشد زمان ۔ کراچی

س : خوش اخلاق انسان کی تعریف ؟

ج : جس سے مل کر خوشی حاصل ہو۔

نونہال ادیب



علم

سیدہ قمر طلعت
حیدر آباد



علم وہ شمع ہے، جس کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ یہ ایک بیش بہا نایاب چیز ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔

آپ نے حضرت علیؓ کا نام تو ضرور سنا ہوگا۔ آپ ہمارے پیارے رسول صلعم کے داماد اور اسلام کے چوتھے خلیفہ تھے آپ علم کی دولت سے مالا مال تھے اور ایک بہت بڑے عالم تھے۔

ایک مرتبہ حضرت علی کے پاس دس مشہور و معروف عالم آئے اور کہنے لگے کہ اگر آپ ہمیں یہ ثابت کر کے بتا دیں کہ علم دولت سے بڑھ کر ہے تو ہم آپ کو اپنے سے بڑا مانیں گے، مگر شرط یہ ہے کہ ہر ایک کو الگ الگ جواب دیا جائے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ مجھے منظور ہے۔ پھر آپ نے پہلے عالم سے کہا کہ علم دولت سے اس لیے بہتر ہے کہ یہ پیغمبروں کا حصہ ہے، دولت تو فرعون کے پاس بھی تھی۔

حضرت علی رضؓ نے دوسرے عالم کو جواب دیا کہ علم دولت سے اس لیے بہتر ہے دولت خرچ کرنے سے ختم ہو جاتی ہے، چاہے قارون کا خزانہ کیوں نہ ہو، مگر علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔

حضرت علی رضؓ نے تیسرے عالم سے کہا کہ دولت کی حفاظت انسان کو کرنی پڑتی ہے، مگر علم انسان کی حفاظت کرتا ہے۔ پھر آپ نے چوتھے عالم سے کہا کہ علم کو دولت پر فوقیت اس لیے حاصل ہے، علم انسان کا دماغ روشن کرتا ہے اور اس کے برعکس دولت انسان کے دماغ میں غرور پیدا کرتی ہے۔

پانچویں عالم نے جب اپنے سوال کا جواب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ علم محدود نہیں ہے، مگر دولت خواہ کتنی ہی ہو، اُس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور اس کی حد مقرر ہے۔

آپ نے چھٹے عالم سے کہا کہ دولت مند انسان کے کتنے ہی دشمن پیدا ہو جاتے ہیں اور خوشی اُس سے دور ہو جاتی ہے، مگر عالم کا کوئی بھی دشمن نہیں ہوتا اور وہ خوش و خرم رہتا ہے۔

پھر آپ نے ساتویں عالم سے کہا، دولت کو چور چرا سکتا ہے، مگر علم کبھی بھی چوری نہیں ہو سکتا اور پھر آٹھویں عالم کا جواب یہ ہے کہ دولت انسان کو کنجوس بناتی ہے، مگر عالم بہت سخی ہوتا ہے اور ہر ایک سے اچھی طرح برتاؤ کرتا ہے۔

حضرت علی رضؓ نے نویں عالم سے کہا کہ دولت کو زنگ لگ سکتا ہے، مگر علم کبھی بھی زنگ آلود نہیں ہو سکتا۔ دسویں اور آخری عالم کے لیے آپ نے فرمایا کہ علم کی وجہ سے ہمارے پیغمبر کا درجہ سب نبیوں سے بڑھ کر ہے۔ علم کتنی بڑی چیز ہے، اس لیے تمھیں بھی چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ علم حاصل کر کے اپنے ملک و قوم کا نام روشن کرو اور اپنے ملک کے لیے باعثِ خوشی بنو۔

اے نونہالو

ظہور الدین گل
ڈیرہ غازی خان



اے نونہالو ! اے نونہالو !
اے ہمتوں کی سنگین چٹانو !
ڈر کے وہ چھوڑو، دل میں جو ٹھانو

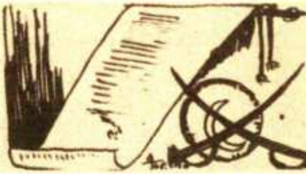
اے نونہالو ! اے نونہالو!
ہمت کا اپنی سکّہ بٹھاؤ
اپنے وطن کا پرچم اڑاؤ
زورِ جوانی ، ہاں آزماؤ

اے نونہالو! اے نونہالو!
کیوں غیر کا ہو احسان گوارا
کافی ہے تم کو اپنا سہارا
مشرق تمھارا، مغرب تمھارا

اے نونہالو ! اے نونہالو!

اور صُلح ہوجاتی ہے

صہیب احمد صدیقی
کندیاں



کام کرنے والے

بایزید . . . . ترک بادشاہ
یزدانی . . . . ترک سپہ سالار
تیمور . . . . . . ریاست فرغانہ کا امیر
امت الحبیب . . . . . یزدانی کی بیوی
اور دوسرے

(پہلا سین)

(آج سے تقریباً پانچ سو سال پہلے امیر تیمور جنگل میں خیمہ زن ہے۔ بایزید اس کے پاس صلح کے لیے قاصد بھیجتا ہے۔ ایک خیمہ میں دربار لگا ہوا ہے۔ تمام درباری اپنی جگہ پر بیٹھے ہیں۔ ایک غلام اندر آتا ہے۔)

غلام : (جھک کر) عالی جاہ ترکی کا قاصد حاضر ہے۔

تیمور : آنے دو۔

(غلام کے ساتھ ایک ترک قاصد داخل ہوتا ہے۔)

تیمور : کہو کیا بات ہے ؟

قاصد : جہاں پناہ ترک آپ سے صلح کے خواہش مند ہیں۔

تیمور : ہنس کر۔ مگر تم اپنے شہنشاہ سے کہہ دو کہ جس طرح آگ اور پانی کا کبھی ملاپ نہیں ہوسکتا، اسی طرح تیمور اور بایزید کے درمیان صلح نہیں ہوسکتی۔

قاصد: جہاں پناہ ! جنگ کا نتیجہ خطرناک ہوتا ہے۔

تیمور : ہم جانتے ہیں۔

قاصد: یہ آپ کا قطعی فیصلہ ہے؟

تیمور: ہاں! بالکل — جاؤ اپنے بادشاہ سے کہہ دو کہ تیمور اور بایزید کے درمیان صلح کی دیوار کھڑی نہیں ہو سکتی (اور قہقہہ لگاتا ہے) — (قاصد جاتا ہے)

(دوسرا سین)

(بایزید محل میں ٹہل رہا ہے، قاصد داخل ہوتا ہے۔)

بایزید: کہو کیا خبر لائے؟

قاصد: حضور انھوں نے صلح سے انکار کر دیا ہے۔

بایزید: کیوں؟

قاصد: کہتا ہے کہ آگ اور پانی کا کبھی اتحاد نہیں ہوتا!

بایزید: اچھا تو یزدانی کو بلاؤ۔

(وقفہ)

یزدانی داخل ہوتا ہے۔

یزدانی: حضور غلام حاضر ہے۔

بایزید: تیمور نے صلح سے انکار کر دیا ہے۔

یزدانی: ہم سب مقابلہ کے لیے تیار ہیں۔

بایزید: بہت خوب! آج ہی فوج لے کر مقابلہ کے لیے روانہ ہو جاؤ۔

یزدانی: خدا آپ کو فتح دے۔

(.... اور سپہ سالار جاتا ہے)

(تیسرا سین)

(میدان جنگ میں یزدانی کی افواج چند دستوں میں بٹی ہوئی ہے۔ جو رات کو چوری چھپے تیمور کی فوج پر حملہ کرتی ہے۔ ترک سپاہیوں کا ایک دستہ پکڑ لیا جاتا ہے۔ ادھر تیمور کا دربار لگا ہے۔ ترکی دستہ اس کے روبرو کھڑا ہے۔ تیمور غضب ناک ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے:

تیمور: (زور سے) تم وہی ترک : سوں نے ہم سے صلح کی خواہش کی تھی؟

(سردار دستہ سر جھکا لیتا ہے)

تیمور: جانتے ہو رات کو چوری چھپے حملہ کی کیا سزا ہے؟

سردار: جہاں پناہ .... موت۔

تیمور: (اپنے سپاہیوں سے) ان سب کو قتل کر دو۔

سردار: مگر ہم سب بے گناہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ بے گناہ کا خون بہانے کی اجازت نہیں دیتا۔

تیمور: ہمارے روبرو تمھیں زبان کھولنے کی اجازت نہیں ہے۔

سردار: (دلیری سے) آپ زبان بندی کا

حکم نہیں دے سکتے۔ ترک ایک بہادر قوم ہے، جس کے مرد اور عورتیں بڑی بہادر ہیں اور میں بھی ایک ۔ ۔ ۔ ۔

(یہ کہہ کر وہ رومال سر سے اتار دیتا ہے۔ اس کے لمبے لمبے بال اس کے شانے پر لہرانے لگتے ہیں)

تیمور: تم عورت ہو..... تم عورت ہو! اور حیرانی سے درباریوں کی طرف دیکھتا ہے۔

(سپہ سالار عورت اسے بھوکی شیرنی کی طرح دیکھتی ہے۔)

تیمور: تمھارا نام کیا ہے؟

سپہ سالار عورت: میرا نام امتہ الحبیب ہے اور میں یزدانی کی بیٹی ہوں۔

تیمور: اچھا تو ہم تمھیں آزاد کرتے ہیں۔ تیمور عورتوں پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہتا۔ تم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جا سکتی ہو۔

سپہ سالار عورت: میں اس کے لیے شکر گزار ہوں، کیا آپ صلح کی پیش کش قبول کریں گے؟

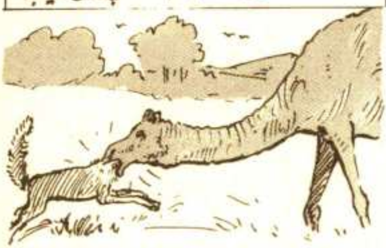
تیمور: (لڑکی کی بہادری سے مرعوب ہو کر) بہت بہتر۔

سپہ سالار امتہ الحبیب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ لشکر میں واپس جاتی ہے اور دوسرے دن دونوں حکمرانوں کے درمیان صلح ہو جاتی ہے۔

(اور پردہ گرتا ہے)

وعدہ خلافی کا انجام

غلام حسین ہاشمی
پنڈی گھیب



ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی جنگل میں ایک اونٹ رہتا تھا۔ بیچارہ بری طرح کمزور تھا۔ اسی لیے تو مالک نے اُسے جنگل میں چھوڑ دیا تھا۔ اونٹ روزانہ سارا دن سبزہ کھاتا رہتا تھا اور شام کو جو جگہ ملتی، بیٹھ کر آرام کرتا۔ غرض اس کے دن بڑے مزے سے گزر رہے تھے۔ اور وہ اس فکر سے بھی آزاد تھا کہ آج اسے سامان اٹھا کر وہاں جانا ہے اور پھر وہاں سے فلاں جگہ۔ بس اس کا کام اب صرف کھانا پینا، اور آرام کرنا ہی تھا۔

اسی جنگل میں ایک بہت ہی چالاک

یدڑ رہتا تھا۔ وہ اپنی چالاکی کی وجہ سے جنگل بھر میں مشہور تھا۔ تمام جانور اس کی چال بازیوں سے تنگ آچکے تھے اور وہ اس گیدڑ سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ گیدڑ نے اونٹ سے بھی دوستی کرلی تھی۔ اس لیے اونٹ کو یہ بہت ستاتا تھا۔ لیکن اس کے برعکس وہ اونٹ کی امداد بھی کرتا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جنگل میں ایک نیا شیر آیا۔ وہ بہت ہی ظالم تھا۔ چھوٹے چھوٹے جانوروں کو کھاجاتا تھا۔

ایک دفعہ اسے پتہ چلا کہ ایک موٹا تازہ اونٹ بھی اس جنگل میں رہتا ہے تو وہ اونٹ کے شکار کے لیے نکل پڑا۔ راستے میں اسے گیدڑ ملا تو گیدڑ نے اپنی چالاکی سے اسے اونٹ کی طرف لے جانے کے بجائے کنویں کا رستہ دکھادیا۔ وہاں گیدڑ نے شیر کو بتایا کہ وہ کنویں میں دیکھے اور اپنے دشمن شیر سے مقابلہ کرے اس پر شیر نے کنویں میں جھانک کر دیکھا تو وہاں پانی میں اپنا عکس دیکھ کر سمجھا کہ دوسرا شیر ہے۔ فوراً پانی میں چھلانگ لگادی اور پھر باہر نہ نکل سکا۔ اس پر اونٹ کی جان بچ گئی اور تمام جانور ایک ظالم سے نجات پا گئے۔

ایک اور دن اونٹ کے پاؤں میں بہت بڑا کانٹا چبھ گیا۔ اونٹ بیچارا بہت بلبلایا، مگر کون اس کی مدد کرنے والا تھا۔ اسی اثنا میں اس کا دوست گیدڑ آگیا۔ آج گیدڑ میاں شرارت کرنے آئے تھے۔ یہ دیکھ کر اور بھی خوش ہوئے اور کہنے لگے، "چچا اونٹ کیا ہوا ہے؟" اونٹ نے بتایا "مجھے کانٹا چبھ گیا ہے، ذرا یہ نکال دو"۔ گیدڑ کو شرارت سوجھی ہوئی تھی، کہنے لگا "مجھے اپنی ران کا گوشت کھلاؤ تب؟" اس پر اونٹ بیچارے نے کہہ دیا، "میں اس کی زبان دیتا ہوں کہ تمھارا وعدہ پورا کروں گا"۔ اب گیدڑ نے جو زبان کا لفظ سنا تو بہت خوش ہوا۔ کہ اونٹ کی زبان کھائیں گے۔ فوراً کانٹا نکالا اور اونٹ سے زبان کا مطالبہ کیا۔ اونٹ بڑا پریشان ہوا۔ کہنے لگا، "بھئی، میں نے زبان تو دینے کا وعدہ نہ دیا تھا، بلکہ ران کا گوشت کھلانے کو کہا تھا۔ آؤ ران کا گوشت کھالو"۔ اس پر گیدڑ نے ضد کی کہ وہ زبان ہی کھائے گا ران تو اس نے نہیں کہی تھی۔

اس پر اونٹ بڑا پریشان ہوا کہ اس گیدڑ کی موت آگئی ہے۔ اب کیسے بچ سکے گا۔

اس نے گیدڑ کو بہتیرا سمجھایا کہ اپنے وعدے کو نہ جھٹلائے۔ ورنہ ۔۔۔! مگر گیدڑ تھا کہ ضد کو چھوڑتا ہی نہ تھا۔ اونٹ جب بہت مجبور ہوا تو دل میں کہنے لگا "چلو! آج اس چالاک اور مکار سے جنگل والوں کی نجات تو ہو جائے گی"۔ گیدڑ کو کہا کہ وہ اپنا منھ اونٹ کے منھ میں ڈالے اور زبان نکال لے۔ اب گیدڑ کی چالاکی ختم ہو چکی تھی۔ فوراً گیدڑ کے منھ میں سر دے دیا۔ اونٹ جو بہت غصے میں تھا، اپنا منھ بند کر لیا تو گیدڑ پھنس گیا۔ اب بہتیرا شور مچایا کہ اونٹ اسے وعدہ خلافی کرنے پر معاف کر دے، مگر اونٹ نے اسے سزا دیے بغیر نہ چھوڑا اور اس کو وہیں ہلاک کر کے پھینک دیا۔

دیکھا بچو! وعدہ خلافی کا انجام! وعدہ کر کے ہمیشہ اسے پورا کرنا چاہیے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ

زیب النساء، آزاد کشمیر



حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خلافت کا زمانہ بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت کی طرح بہت ہی مختصر ہے، لیکن جس طرح عہدِ صدیقیؓ بہت اہم اور قیمتی زمانہ تھا، اسی طرح عمر بن عبدالعزیزؒ کی خلافت کا زمانہ بھی عالمِ اسلام کے لیے نہایت ہی قیمتی اور کامیاب زمانہ گزرا۔

بنو امیہ کی حکومت نے بتدریج لوگوں میں دنیا پرستی اور حُبِ جاہ و مال پیدا کر کے آخرت کی طرف سے غفلت پیدا کر دی تھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خلافت نے یک لخت ان تمام خرابیوں کا سدِّباب کیا اور مسلمانوں کو پھر سے نیکی کی طرف راغب کر دیا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے خلافتِ اسلامیہ کو خلافتِ راشدہ کے نمونے پر قائم کر کے عہدِ صدیقی اور عہدِ فاروقی کو دنیا میں واپس بلا لیا۔ خلفا کے جبر و استبداد کو وہ سخت ناپسند کرتے تھے اور دنیا میں آزادی اور امن قائم کر کے ہر شخص کو اُس کے انسانی حقوق ملنے کا موقع دینا چاہتے تھے۔

آپ ماتحتوں سے اس بات کے خواہاں نہ تھے کہ اُن کی ہر جا بے جا بات کی تائید کی جائے۔ وہ خلیفہ کو رعایا کا حکمران اور

فرمانروا نہیں جانتے تھے، بلکہ مسلمانوں کا مشفق باپ سمجھتے تھے۔ غرض یہ کہ عہدِ صدیقیؓ اور فاروقیؓ میں جو کچھ تھا اُس کے تمام و کمال نمونے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد میں موجود پائے۔ اس لیے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے وفات پانے پر خلافت راشدہ ختم ہوگئی۔ ان کے زمانے میں کثیر تعداد میں غیر مسلموں نے اسلام قبول کرلیا۔ نومسلموں کی یہ تعداد و کثرت کسی دوسرے خلیفہ کے زمانے میں نظر نہیں آئی۔ حالاں کہ آپ کے عہد خلافت میں لڑائیاں بہت کم ہوئیں، تاہم آپ کی سلطنت کی حدود سندھ، پنجاب، بخارا، ترکستان اور چین سے لے کر مراکش، اندلس اور فرانس تک وسیع تھیں۔ اتنی بڑی سلطنت میں ہر جگہ یکساں سکون و امن موجود تھا۔

زمانہ منزلِ ارتقا کی راہ پر تیزی سے گامزن تھا، سڑکیں نکالی گئیں۔ جگہ جگہ اسکول اور شفاخانے وغیرہ جاری ہوئے۔ عدل و انصاف آپ کے بعد دنیا نے کہیں نہ دیکھا۔

خدا ہمیں بھی اپنے بزرگانِ سلف کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

...

ہمارے ارادے

نعیم احمد اشرف
کراچی



عِلم کا پرچم اڑاتے چلیں گے
علم کو ہمدم بناتے چلیں گے
پیار اور محبت کے اعمال سے
زمانے کو اپنا بناتے چلیں گے
کانٹوں کو راہ سے ہٹاتے ہوئے
ہر اک قدم پہ پھول کھلاتے چلیں گے
وطن کی زمیں سے محبت ہے ہم کو
وطن پہ ہم جاں تک لٹاتے چلیں گے
چمکتے ہیں جیسے تارے فلک پر
وطن کو ہم یوں ہی بناتے چلیں گے
ہیں چھوٹے تو لیکن ارادے بڑے
ارادوں کو ہمدم بناتے چلیں گے
مسلماں ہیں اسلام سے ہے محبت
اخوت کو اپنی نبھاتے چلیں گے
کریں عہد مل کر ارادوں پہ اشرف
مقدر کو اپنے بناتے چلیں گے

عقل مندی

سلیم اختر
کیمبل پور



ایک دفعہ خلیفہ ہارون رشید کے دربار میں دو مجرم لائے گئے۔ خلیفہ نے ایک ملزم سے کہا کہ کیا تم نے چوری کی ہے؟ اُس نے نیچی نظریں کیے ہوئے کہا، نہیں جناب، اب خلیفہ نے دوسرے مجرم سے سوال کیا تو اس نے بھی وہی جواب دیا۔ ایک کہتا، اُس نے کی ہے اور دوسرا کہتا، اُس نے کی ہے۔ دونوں میں بحث و تکرار ہوتی رہی۔ خلیفہ نے دونوں کو الگ الگ جگہ پر کھڑا کیا اور کہا اپنا اپنا سر کھڑکیوں سے باہر نکالو۔ دونوں نے اپنا اپنا سر باہر نکالا تو خلیفہ نے فوراً کہا کہ میں نے چور کو پہچان لیا ہے۔ وہ سر اندر کرلے اور جلاد کے سامنے آجائے۔ جو چور تھا اُس کا رنگ زرد پڑ گیا اور اُس نے سر اندر کرلیا۔ جو بے قصور تھا اسے چھوڑ دیا گیا۔ اب چور جلاد کے سامنے آیا تو خلیفہ نے جلاد کو روک دیا اور کہا کہ میں نے تو چور کو پہچاننا تھا، مجھے معلوم ہوگیا۔ یہ ان کی عقل مندی تھی۔

چالاک اندھا

ابن حسن
کراچی



کہتے ہیں بغداد میں ایک فقیر رہتا تھا۔ خدا نے اس کی دونوں آنکھیں چھین لی تھیں۔ اس فقیر کے پاس سو رُپے تھے۔ بیچارہ ان رُپوں کو چھپانے کی فکر میں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر کسی کو ان رُپوں کا علم ہوجائے تو بھیک ملنا مشکل ہوجائے گی۔

ایک روز وہ مسجد میں داخل ہوا۔ جب صحن میں پہنچا تو اس کے ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑا۔ اس نے بیٹھے ہی بیٹھے فرش پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔ اس کے ہاتھ کو فرش کا ایک بہت چھوٹا سا پتھر لگا، جو اس کی

ٹھوکر سے اکھڑ چکا تھا۔ اس نے ہاتھ کو اور حرکت دی تو اس کا ہاتھ ایک گڑھے میں چلا گیا، جو اس پتھر کے نکلنے پر ہوا تھا۔ اندھے نے سوچا، موقع اچھا ہے، اس وقت مسجد میں کوئی نہیں ہوگا، کیوں کہ جس وقت میں گرا تھا تو مجھے اٹھانے کوئی نہیں آیا تھا۔ لہٰذا یہ رُپے اگر میں نے یہاں چھپا دیے تو کسی کو خبر بھی نہ ہوگی۔

یہ سوچ کر اس نے کمر سے بٹوہ نکالا اور گڑھے میں رکھ کر اس کا منھ جوں کا توں بند کر کے چلا گیا۔

خدا کی شان، کسی کا فائدہ کِسی کا نقصان۔ ایک شخص مسجد میں بیٹھا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔

اندھے کے جاتے ہی اس نے گڑھے میں سے بٹوہ نکالا اور چل دیا۔

دوسرے دن جب اندھے نے پتھر اٹھایا تو بٹوہ نہ پاکر پریشان ہوگیا، مرتا کیا نہ کرتا۔ اس نے چور کو پکڑنے کی ٹھان لی۔

دوسرے دن اندھا اپنے چھوٹے لڑکے کو ساتھ لیتا آیا اور مسجد کے باہر بیٹھا بھیک مانگنے لگا۔ اس نے لڑکے کو تاکید کی کہ اگر کوئی ہماری طرف دیکھ کر مسکرائے تو تُو اس کا پتہ لگا کر آنا۔

چناں چہ ایک روز لڑکے نے اندھے کے کان میں کہا، "ابّا! ایک آدمی ہماری طرف دیکھ کر مسکراتا ہوا جا رہا ہے، میں ابھی پتہ لگاتا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد اندھا ایک مکان پر دستک دے رہا تھا۔ دروازہ اسی شخص نے کھولا، جس نے بٹوہ چرایا تھا وہ اندھے کو دیکھتے ہی گھبرا گیا اور بولا، "فرمائیے"؟

"مجھے سیٹھ عارف سے ملنا ہے۔" اس نے کہا۔

"جی ہاں! میں ہی عارف ہوں۔" عارف نے کہا۔

اندھے نے کہنا شروع کیا، "تمھیں یقین نہ آئے گا۔ میرے پاس اللہ کے فضل سے تین سو رُپے ہیں۔ دو سو رُپے تو اپنے ایک رشتہ دار کو دے رکھے ہیں، جو کل لوٹا دے گا اور ایک سو رُپے چھپا رکھے ہیں۔ لہٰذا کل آپ کو میں تین سو رُپے لا کر دوں گا۔ مہربانی فرما کر اسے امانت کے طور پر رکھنا۔ مجھے جب بھی ضرورت ہوگی تو لے جاؤں گا۔" اندھے نے اس سے وعدہ لیا اور چلا گیا۔

عارف سوچنے لگا، "میں نے جو رُپیہ اڑا لیا ہے۔ اس کی ابھی اندھے کو ہوا نہیں لگی۔ جب اسے معلوم ہوگا کہ وہاں رُپیہ نہیں ہے تو وہ پریشان ہوگا۔ اندھے کو معلوم ہونے سے پہلے ہی مجھے یہ رُپے وہاں رکھ دینے چاہییں۔ کل جب اندھا تین سو رُپے لے کر آئے گا تو وہ اپنے ہوں گے۔ اندھے کے احتجاج کرنے پر لوگ یہی کہیں گے کہ ایک بھیک منگا، جسے دو وقت روٹی مشکل سے میسّر آتی ہو، تین سو رُپیہ کہاں سے لائے گا؟" یہ سوچ کر عارف بٹوہ پھر اسی جگہ رکھ آیا اور دوسرے روز کا انتظار کرنے لگا۔ اندھا لڑکے کو لے کر تاک میں بیٹھا ہی تھا۔ عارف کے مسجد سے نکلتے ہی اندھے نے بٹوے پر قبضہ کر لیا۔

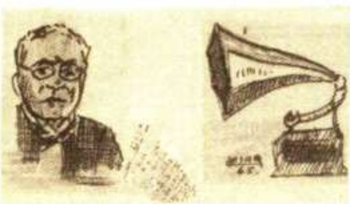
دوسرے دن اندھے کا کافی انتظار کرنے کے بعد عارف اندھے کے پاس آیا۔ قریب آکر اس نے کہا، "قبلہ، آج آپ نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔"

اتنا سنتے ہی اندھا دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ روتے ہوئے اس نے کہا، "کیا کروں میرے رشتہ دار نے میرے پیسے دینے سے انکار کر دیا۔ اس نے مجھے دھوکہ دیا۔ اور جس جگہ میں نے رُپے چھپائے تھے وہاں سے بھی کسی نے چُرا لیے۔"

تو بچّو! اس طرح اندھے نے عارف کی آنکھیں کھول دیں۔

گراموفون

محمد حفیظ الرحمٰن
سیالکوٹ



تم میں سے بہت سوں نے گراموفون دیکھا ہوگا کیا تمھیں معلوم ہے کہ یہ کس طرح ایجاد ہوا۔ اگر نہیں معلوم تو آؤ میں تمھیں بتاؤں کہ یہ کس طرح ایجاد کیا گیا۔

مدّت سے سائنس داں یہ محسوس کرتے تھے کہ انسان جو باتیں کرتا ہے وہ ہوا میں محفوظ رہتی ہیں۔ ان کی کوشش تھی کہ اس آواز کو قابو کر لیا جائے۔ آج تو گراموفون کیا ریڈیو اور بے تار برقی سے دُور دراز کی باتیں سن سکتے ہیں، لیکن شروع میں اس کی تلاش میں بڑی دقتیں اٹھانی پڑیں۔ کہتے ہیں آج سے تین ہزار برس پہلے

ایک موقع پر ایک چینی سرکاری عہدہ دار کو جو دارالحکومت سے کئی ہزار میل دور تھا، شاہِ چین کو ایک ضروری پیغام بھیجنا تھا۔ اس کو قاصد پر اعتبار نہیں تھا، آخر اُس نے ایک صندوق میں اپنی آواز بند کردی اور قاصد کو دیا کہ یہ صندوق شاہ کو جا کے دے دو۔ قاصد نے اُس صندوق کو بادشاہ کے حضور پیش کیا۔ صندوق کے کھلتے ہی اُس میں سے آواز آنی شروع ہوگئی اور بادشاہ نے اپنے عہدہ دار کا پیغام سن لیا۔

یورپ میں پرانے زمانے سے فونوگراف کی ایجاد کی کوشش ہو رہی تھی۔ ۱۲۰۴ء میں راجر بیکن نے ایک ایسا مجسمہ بنایا جو باتیں کرتا تھا۔ ایک اطالوی پورٹو نے ۱۵۸۰ء میں ایک نلکی کے اندر آواز کو بند کردیا تھا اور جب لوگوں نے نلکی سے آواز سنی تو لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔

گراموفون کی ایجاد کا سہرا ٹامس الوا ایڈیسن کے سر ہے۔ ایڈیسن دورِ حاضر کا سب سے بڑا موجد گزرا ہے۔ اُس کی ایجادوں کے مفصّل حالات قلمبند کیے جائیں تو اُن سے متعدّد کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ ایڈیسن بچپن ہی سے دوسرے لڑکوں سے نرالا معلوم ہوتا تھا۔ اور لڑکے کھیل کود میں وقت گزارتے، مگر ایڈیسن کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا۔ ایڈیسن نے ۶ سال کی عمر میں اپنی ماں سے "تاریخ انگلستان" پڑھنی شروع کردی۔ دس سال کی عمر میں ایڈیسن کو کیمسٹری (علمِ کیمیا) پڑھنے اور اس کے تجربے کرنے کا شوق پیدا ہوگیا۔

بارہ سال کی عمر میں ایڈیسن کو ریل گاڑی میں اخبار بیچنے کا کام ملا۔ چلتی گاڑی میں اُس نے ایک چھوٹے سے کمرے کو اپنی تجربہ گاہ بنا رکھا تھا۔ ایک دن اس میں تجربہ کرتے وقت کچھ دوائیں بھک سے اڑ گئیں اور کمرے میں آگ لگ گئی۔ گارڈ نے آگ تو بجھا دی، لیکن ایڈیسن کا سارا سامان باہر پھینک دیا اور کنپٹی پر ایک گھونسا رسید کر کے اُسے باہر نکال دیا۔ اس گھونسے کی ضرب سے ایڈیسن ہمیشہ کے لیے بہرا ہوگیا۔ آخر اس نے نیویارک کے ایک کارخانے میں ملازمت اختیار کرلی۔ جہاں اُس نے بولنے والی مشین بنالی۔ اس طرح اس کی عزّت چار دانگ عالم میں پھیل گئی۔

شروع شروع میں گراموفون بڑے بھدّے بنتے تھے اُن سے کھر کھر کی آواز پیدا ہوتی تھی اور جب تک ربڑ کی نلکیاں کانوں میں نہ لگائیں آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بڑی کوشش کے بعد ایڈیسن نے یہ کھڑکھڑاہٹ دُور کی اور نلکی کی جگہ بھونپو نے لے لی، لیکن اب تو ایسے گراموفون بن گئے ہیں جن میں بھونپو کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اُن کی وضع قطع بھی اچھی ہوگئی ہے اور وہ بڑے خوب صورت لگتے ہیں۔



تمھارا خیال ہے

علم کا خزانہ

آپ کا رسالہ "ہمدرد نونہال" ہر ماہ پڑھتی ہوں۔ رسالہ بہت اچھا ہے، بلکہ علم کا خزانہ ہے۔ اِتنی معلومات کسی رسالے میں نہیں۔ خدا دشمن کی نظر بد سے دُور رکھے۔ آمین۔ میں نے اپنی سہیلی کو بھی ہمدرد نونہال پڑھنے کا مشورہ بلکہ تحفہ بھیجا ہے۔ نسیم اختر۔ لائل پور

ترقی

پہلی مرتبہ ہمدرد نونہال نظر سے گزرا۔ پڑھا، بہت پسند آیا۔ اس کا سرورق بہت خوب صورت تھا۔ ہمدرد نونہال پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا خاص کر نظم، بچّوں کی دُعا، دنیا کا سب سے پہلا کیمیا داں اور دنیا کا سب سے پُرانا جہاز بہت پسند آئے۔ ہمدرد نونہال دِن بہ دن ترقی کی طرف گامزن ہے۔ اللہ تعالےٰ اسے اور ترقی دے۔

محمد فارُوق۔ کراچی

پہلی بار

ہمدرد نونہال کو آج پہلی مرتبہ پڑھنے کا موقع ملا۔ واقعی یہ ایک عظیم رسالہ ہے۔ مندرجہ ذیل کہانیاں بہت

پسند آئیں:
وفادار سپاہی، بجلی کے خطروں سے نونہالوں کو آگاہ کر دیا، ماں کی دُعا، ان الفاظ کے معنی کیا ہیں۔ اگر یہ سلسلہ 'الف' سے لے کر 'ے' تک سلسلے وار چلایا جائے تو اور بھی آسانی ہو سکتی ہے۔ امید رکھتا ہوں کہ نونہال کو اور بھی خوب صورت رسالہ بنایا جائے گا۔ ایک کہانی "تدبیر ہے تو سب کچھ ہے" بہت ہی اچھی ہے۔ میری طرف سے نونہال کے مصنفوں کو سلام علیکم۔

شبلو ضیا نوشاد۔ ٹنڈو آدم

سال نامہ

ستمبر ۱۹۶۵ء کا نونہال ملا۔ بچوں نے خوش آمدید کہا۔ میں بڑی بے چینی سے ہمدرد نونہال کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر کار ہمدرد نونہال آ ہی گیا۔ میں یہ رسالہ تین سال سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ ٹائیٹل بہت خوب صورت ہوتا ہے۔ ہمارا پیارا نونہال پہلے سے بہت بدل چکا ہے اور بہت ترقی کرتا جا رہا ہے۔ کہانیاں، نظمیں بہت پسند آئیں۔ خاص طور پر کہانیوں میں دو دشمن کتے، روشنی، ماں کی دعا، بہادر خرگوش، چھوٹا بیٹا، چھوٹا گھوڑا اور شاہ زادی، نونہال ادیب، نظمیں سب کی سب بہت پسند آئیں۔ معلوماتی مضامین میں سے دنیا کا سب سے پہلا کیمیا داں، اخبار نونہال، دنیا کا سب سے پرانا جہاز، بہت پسند آئے۔ ہمدرد نونہال میں ایک چیز کی کمی ہے۔ وہ سال نامہ ہے۔ اگر آپ سال نامہ بھی شائع کریں تو بہت اچھا ہو گا۔

محبوب علی بدرالدین

تہذیبی مضامین

ستمبر کا شمارہ نظروں سے گزرا۔ ٹائیٹل بہت اچھا تھا۔ مضامین قابلِ تعریف ہیں۔ سارے مضامین، جو دیے جاتے ہیں، مجھے بہت پسند ہیں۔ خاص کر جو تہذیبی مضامین ہوتے ہیں، بہت اچھے۔ میری رائے ہے کہ آپ جتنے ہو سکتے ہیں، سائنسی مضمون لکھا کریں۔

مرزا محمد ابراہیم۔ کراچی

انعامی کہانیاں

ہمارا محبوب رسالہ ماشاءاللہ بہت

ترقی کر رہا ہے۔ ستمبر کے مہینے میں "ماں کی دُعا" اور ڈرامہ "روشنی" پسند آیا۔ خدا کرے ہر رسالہ ایسے ہی اچھے مضمونوں اور کہانیوں سے بھرپور ہوا کرے۔ ویسے میں ایک چیز کی کمی محسوس کرتا ہوں، وہ ہے "انعامی کہانیاں"۔ اگر آپ کچھ کہانیاں نونہالوں سے لکھوا کر ان میں مقابلہ کرا کے انعام دیا کریں تو یقیناً ہمارے اس رسالے میں ایک اچھی چیز کا اضافہ ہو جائے گا۔

سلمان احمد۔ کراچی

انعامی معمّا

نونہال کا میں چار سال سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ اس میں جتنی بھی خامیاں تھیں، دُور ہو گئیں، مگر ایک چیز کی کمی رہ گئی ہے۔ وہ ہے انعامی معمّا۔ امید ہے، آپ انعامی معمّا بھی ضرور شائع کیا کریں گے۔

شاہد صدّیق۔ گجرات

آرٹ پیپر پر

اگست کا شمارہ ہمدرد نونہال پڑھا۔ ویسے تو پسند آیا، لیکن ایک تو چھپائی اچھی نہیں، دوسرے ہمدرد نونہال آرٹ پیپر پر شائع کیا کریں اور بور ہونے والی کہانیاں شائع نہ کیا کریں۔ اگر اس کے صفحات کو بڑھا کر دلچسپ مضامین کا سلسلہ شروع کیا جائے تو بہتر ہوگا۔

محمد ایوب۔ ضلع مردان

ستمبر کے نونہال کی خوبیاں

۱۔ ستمبر کے نونہال کا سرورق نئے انداز اور دل کشی سے چھپا۔
۲۔ "بچوں کی دعا" اور "کھیل" نظمیں بہت پسند آئیں۔
۳۔ "روشنی" ڈراما قابلِ تعریف ہے۔
۴۔ نونہال ادیب کا کالم پہلے سے بہت بہتر ہے۔
۵۔ الفاظ کے معنی تعلیمی قابلیت میں اضافہ کرتے ہیں۔
۶۔ "ماں کی دعا" واقعی دُعا تھی۔
۷۔ مزید تعریف کی ضرورت نہیں۔

ملک جاوید صیاد۔ کوئٹہ

کوئی جواب نہیں

اگست کا رسالہ ملا۔ ٹائیٹل اتنا

خوب صورت تھا کہ آنکھیں ہٹانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ کہانیوں میں "مرغابی کا شکار" [illegible] "عقل مند کی دور بلا" بہت پسند آئیں۔ میرا خیال ہے کہ رسالے میں کوئی معمّا بھی شروع کردیا جائے۔ معلوماتی کہانیوں میں "جنگل کا آدمی"، "برف کے تودے"، "اسفنج کیا ہے" بہت پسند آئے۔

محمد قمر الزماں۔ اوکاڑہ

جواب نہیں

اگست کا ہمدرد نونہال پہلی بار پڑھا۔ میں نے آج تک ایسا کوئی بچّوں کا رسالہ نہیں دیکھا۔ کیا کہانیاں اور نظمیں تھیں، بس جواب نہیں۔ اخبار نونہال اور نونہال ادیب بہت پسند آئے۔ "ان الفاظ کے معنی کیا ہیں" سے ہمیں بہت سے مشکل الفاظ کے معنی مل جاتے ہیں۔ کہانیاں سب بہت ہی اچھی تھیں۔

ستمبر ۱۹۶۵ء کا ہمدرد نونہال بھی خریدا۔ سرورق دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ کہانیاں ایک سے ایک بڑھ کر تھیں۔

شمس الدین۔ کراچی

اگست کا شمارہ

نونہال کی موجودہ شکل میں پہلی دفعہ اگست ۶۵ء کا شمارہ کل ہی پڑھا۔ اب تک حیران ہوں کہ کس مضمون کو بہتر قرار دوں اور کس کو نہیں۔ نظم وغیرہ کا بھی یہی حال ہے۔ بہرحال ہمدرد نونہال بہت پسند آیا، جس کے لیے حکیم محمد سعید دہلوی صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ مجھے پاکستان کے دوسرے تمام رسالوں میں ہمدرد نونہال سب سے زیادہ پسند آیا۔ اس میں چند ایسی خوبیاں ہیں، جو دوسرے پرچوں میں نہیں ہیں۔ کہانیاں و مضامین سبق آموز ہیں۔

محمد ظفر الدین احمد ضیائی۔ ڈھاکہ

نظمیں

ہمدرد نونہال پہلی بار نظر سے گزرا۔ تمنّا یہ ہے کہ آپ نظمیں زیادہ شائع کیا کریں۔ باقی کہانیاں اور مضمون بہت اچھے تھے۔ یقین کریں، پڑھ کر دل بہت خوش ہوا اور معلوماتی مضامین پڑھ کر تو بہت خوشی ہوئی۔

رضوان احمد زاہد۔ تاندلیانوالہ

ان الفاظ کے معنی کیا ہیں؟

آبرو : اعتبار، عزّت، حیثیت
آغاز : شروع، ابتدا
اخوت : بھائی ہونا، بھائی چارہ
ادھوری : وہ چیز جو پوری نہ ہو، پوری کی ضد
اعزاز : عزّت دینا، عزّت، رتبہ
بلاغت : تیز زبانی، وہ علم جس میں اعلا درجہ کی خوش بیانی کے قواعد کی تعلیم ہو۔
پٹاری : چھوٹی ٹوکری، جس پر ڈھکن ہوتا ہے۔
پژمردہ : مرجھایا ہوا۔
تقلید : کسی کے قدم بہ قدم چلنا
تلاوت : قرآن کریم پڑھنا، پڑھنا
تلخ : کڑوا، ناگوار، تند و تیز
جوہر : قیمتی پتھر، ہیرا
حقوق العباد : بندوں کے حقوق
خبط : جنون، دیوانگی
خوش الحان : اچھی آواز والا
خیانت : امانت میں چوری، بے ایمانی
دل برداشتہ ہونا : طبیعت کا ہٹ جانا، بد دل ہونا
رنجیدہ : ناخوش، ناراض
روایت : کسی کی بات نقل کرنا
زوال : کمی، اتار، ترقی اور عروج کا جاتا رہنا

ستائش : تعریف کرنا، سراہنا
سگھڑ : ہنرمند، اچھے سلیقے والی
شائستہ : تعلیم یافتہ، تربیت یافتہ، سیدھا
شجاعت : بہادری، دلیری
شفّاف : نہایت صاف جس میں آرپار نظر آئے۔
طعنہ : بُرا بھلا کہنا
عارضہ : مرض، روگ
عداوت : دشمنی
عظمت : بڑائی
غیرت : شرم، حیا
فصاحت : خوش بیانی۔ کلام میں ایسے الفاظ ہونا جن کو اہلِ زبان بولتے ہیں ثقیل، بھدّے الفاظ نہ ہوں۔
کٹھن : سخت، مشکل
کھلنڈرے : کھیل کود میں مشغول رہنے والے
کنجشک : چڑیا
کوس : دو میل کا فاصلہ
گوہر : قیمتی پتّھر
لُنجا : ہاتھ پاؤں سے معذور
مرحلہ : اہم کام، منزل، بڑی مسافت
نڈھال : سست، تھکا ماندہ
ہنرمند : ہنر والا، دست کار

حلقۂ دوستی

جا… اختر

عمر : ۱۷ سال   تعلیم : سال اوّل

دل چسپیاں : تبادلہ ٹکٹ - قلمی دوستی - کرکٹ -

پتہ : کوٹھی نمبر بی/۹۹ - ریلوے روڈ - ملتان کینٹ

تاج محمد

عمر : ۱۰ سال   تعلیم : چوتھی جماعت

دل چسپیاں : کھیلنا کودنا - ہمدرد نونہال پڑھنا -

پتہ : بلاک ۹ کوارٹر ۱۲ - نیپیئر پولیس اسٹیشن - کراچی

حافظ ہلال احمد

عمر : ۱۰ سال   تعلیم : قرآن حفظ کرنا

دل چسپیاں : ہمدرد نونہال پڑھنا ٹکٹ جمع کرنا -

پتہ : اے/۱۴۹ جی - او کالونی - ماڈل ٹاؤن بی - بہاولپور

سہیل مرزا

عمر : ۸ سال   تعلیم : پنجم

دل چسپیاں : ٹکٹ جمع کرنا - کرکٹ - کھیل کود قلمی دوستی -

پتہ : ۴/۱۰/اے ۵ ناظم آباد - کراچی ۱۸

جلال خان

عمر : ۱۱ سال   تعلیم : ششم

دل چسپیاں : کرکٹ کھیلنا - کہانیاں سننا - پڑھنا -

پتہ : ششم اے - گورنمنٹ ہائی اسکول تھانہ مالاکنڈ ایجنسی

عبد الرّقیب

عمر : ۱۴ سال   تعلیم : نہم

دل چسپیاں : ٹکٹ جمع کرنا - ہمدرد نونہال کا مطالعہ -

پتہ : ۱۳۱ - ایف - جیل روڈ - کراچی ۵

محمد فیض علی خاں

عمر : ۱۸ سال   تعلیم : ہشتم

دل چسپیاں : قلمی دوستی - مطالعہ

پتہ : ۴۷ - نواب پور روڈ - اپر فلیٹ - ڈھاکہ ۱

عبد الرسول صدر الدّین

عمر : ۱۴ سال   تعلیم : آٹھویں جماعت

دل چسپیاں : تعلیم حاصل کرنا اور قلمی دوستی وغیرہ

پتہ : ۱۴۴ جی - آر - ڈبلیو - تین ہٹی لارنس روڈ - کراچی ۵

محمد فخر عالم ملک

عمر : ۱۷ سال   تعلیم : فرسٹ ایئر سائنس

دل چسپیاں : قلمی دوستی - اخبار بینی

پتہ : معرفت نصیر الدین ملک - صدر ہسپتال - دیناج پور
مشرقی پاکستان -

محمد علی عباس علی

عمر : ۱۸ سال   تعلیم : دہم

دل چسپیاں : قلمی دوستی ، مصوّری ، افسانہ نگاری.

پتہ : محمّدی ہوٹل - موسیٰ لین نمبر ۲ گل زاری کراچی

بشیر احمد کھوسہ

عمر : ۱۴ سال   تعلیم : دہم

دل چسپیاں : قلمی دوستی

پتہ : جماعت دہم گورنمنٹ اسکول تونسہ ضلع ڈیرہ
غازی خاں

محمد مناظر صدیقی

عمر : ۱۰ سال   تعلیم : پنجم

دل چسپیاں : رسالے پڑھنا - کیرم کھیلنا - تلاوت کرنا -

پتہ : مناظر امام معرفت نیشنل دواخانہ - ملیر سٹی کراچی ۲۳

سید ساجد احمد

عمر : ½۱۶ سال   تعلیم : دہم

دل چسپیاں : تحصیل علوم اعلا - ٹکٹ اور سکے جمع کرنا

پتہ : معرفت سید سجاد حیدر قانون گو مکان ۹۵/۸ حافظ آباد

ایم - ایس سجاد

عمر : ۱۷ سال   تعلیم : سیکنڈ ایر

دل چسپیاں : قلمی دوستی - مطالعہ - بیڈمنٹن -

پتہ : ۱۰۰/۲ منظور آباد - مصری شاہ - لاہور

خالد احمد شمسی

عمر : ۱۳ سال   تعلیم : ہشتم

دل چسپیاں : قلمی دوستی کرنا - ٹکٹ جمع کرنا - کرکٹ کھیلنا -

پتہ : شاہد اینڈ کمپنی ۱۱۹ - صدر گھاٹ روڈ - چاٹگام

جاوید اقبال

عمر : ۱۲ سال   تعلیم : ششم

دل چسپیاں : کبڈی کھیلنا - ہاکی کھیلنا - قلمی دوستی

پتہ : معرفت خورشید عالم نزد ہائی اسکول چک جھمرہ

رضوان احمد

عمر : ۷ سال   تعلیم : اوّل جماعت

دل چسپیاں : فٹ بال کھیلنا

پتہ : ۱۴/۱۱ بی ایریا لیاقت آباد - کراچی

سجاد احمد خاں لودھی

عمر : ۱۴ سال   تعلیم : نہم

دل چسپیاں : قلمی دوستی - باغبانی - خطوں کا جواب دینا

پتہ : معرفت نائب صوبے دار پوسٹ بکس ۱۰۵ ، ملتان چھاؤنی

عبدالکلیم خاں

عمر : ۱۲ سال   تعلیم : ہشتم

دل چسپیاں : ٹکٹ جمع کرنا - نونہال کا مطالعہ - نماز پڑھنا

پتہ : ۱۳۰۲ - اے - ڈھورا لائن - روہڑی

محمد سرور

عمر : ۱۶ سال   تعلیم : ہشتم

دل چسپیاں : ٹکٹ جمع کرنا - کرکٹ کھیلنا -

پتہ : محمد سرور - الفاروق ہائی اسکول ریشم گلی - حیدرآباد

حسنین احمد

عمر : ۱۶ سال   تعلیم : دہم

دل چسپیاں : کرکٹ کھیلنا - تیرنا - باکسنگ - نونہال پڑھنا

پتہ : معرفت طلا محمد خاں ایس - آئی - نشتر آباد - پشاور شہر

جمشید عالم مرزا

عمر : ۱۴ سال   تعلیم : نہم

دل چسپیاں : ٹکٹیں جمع کرنا - برقی تجربے کرنا اور کھیلنا

پتہ : معرفت ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول سرائے نعمت خاں

شہباز اکبر

عمر : ۱۰ سال   تعلیم : چہارم

دل چسپیاں : ہمدرد نونہال پڑھنا - ٹکٹ جمع کرنا

پتہ : معرفت سیٹھی گلاس ورکس - ویسٹرج - راولپنڈی

سبطین احمد

عمر : ۱۰ سال   تعلیم : پنجم

دل چسپیاں : تیرنا - باسکٹ بال کھیلنا - نونہال پڑھنا

پتہ : طلا محمد خاں - نشتر آباد - پشاور شہر

محمد [illegible] اللہ

عمر: [illegible] سال تعلیم: ششم

دل چسپیاں: لکھنا پڑھنا، ٹکٹیں جمع کرنا

پتہ: میونسپل ہائی اسکول۔ نواب شاہ

ملک منظر علی

عمر: ۱۳ سال تعلیم: نہم

دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ کتابیں پڑھنا

پتہ: جماعت نہم اے۔ رول نمبر ۱۹۔ اسلامیہ ہائی اسکول۔ سرکلر روڈ۔ راولپنڈی۔

علیم الدین شیخ

عمر: ۱۷ سال تعلیم: دہم

دل چسپیاں: خدمتِ خلق کرنا۔ مطالعہ اور قلمی دوستی

پتہ: مکان ۹۸۸، سہوانی پاڑہ۔ کوٹری۔

احمد نصیر

عمر: ۱۲ سال تعلیم: ششم

دل چسپیاں: ہاکی کھیلنا، ٹکٹ جمع کرنا۔

پتہ: ۲۶۲/۷ بلاک ڈی۔ یونٹ ۹۔ لطیف آباد۔ حیدر آباد

محمد رمضان الوری

عمر: ۱۲ سال تعلیم: ششم

دل چسپیاں: رسائل پڑھنا۔ فٹ بال کھیلنا

پتہ: معرفت جان محمد پولیس چوکی اسٹریٹ۔ رنچھوڑ لائن کراچی۔

محمد جاوید اقبال تبسم

عمر: ۱۲ سال تعلیم: نہم

دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ فوٹو گرافی

پتہ: مکان نمبر ۱۲ محلہ گڑھا منڈی بہاؤ الدین، ضلع گجرات

جاوید اختر

عمر: ۱۳ سال تعلیم: ششم

دل چسپیاں: ہمدرد نونہال پڑھنا اور نماز پڑھنا

پتہ: زینت محل نمبر ۴ ٹاپ فلور، دہلی سوداگر کالونی۔ کراچی ۵

شوکت سلیم

عمر: ۱۲ سال تعلیم: ہفتم

دل چسپیاں: فٹ بال کھیلنا۔ قلمی دوستی۔ نونہال کا مطالعہ

پتہ: معرفت ایس۔ ایم شریف۔ محلہ برجی والا۔ جھنگ صدر

سیّد ایوب علی نقوی

عمر: ۱۲ سال تعلیم: ششم

دل چسپیاں: نماز پڑھنا، کرکٹ کھیلنا۔ اسلامی کتابیں پڑھنا۔

پتہ: سیّد اکبر علی نقوی بدایونی ماڈل کالونی مکان ۲/۳۶ کراچی ۲۴

محمد سہیل انصاری

عمر: ۱۸ سال تعلیم: انٹر سائنس

دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ ٹکٹ جمع کرنا اور پڑھنا۔

پتہ: مکان نمبر ۸/۵ پریس کوارٹرز، پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی ۵

ایاز ایم بشیر

عمر: ۱۲ سال تعلیم: ہفتم

دل چسپیاں: بیڈمنٹن کھیلنا، قلمی دوستی، فوٹو گرافی

پتہ: ۱۷ جے، جوبرجی گارڈنز۔ لاہور ۶

محمد اسماعیل

عمر: ۱۶ تعلیم: معمولی

دل چسپیاں: رسالے پڑھنا۔ فوٹو گرافی۔ نماز پڑھنا

پتہ: معرفت اے عبدالکریم اینڈ کمپنی۔ میٹھادر۔ کراچی

امجد کریم

عمر: ۱۶ سال   تعلیم: میٹرک

دل چسپیاں: کرکٹ کھیلنا۔ قلمی دوستی اور پڑھنا

پتہ: گورنمنٹ کوارٹر نمبر ۱۲۰ ایف۔ جیل روڈ۔ کراچی

نثار احمد شیخ

عمر: ۱۴ سال   تعلیم: نہم

دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ ہمدرد نونہال پڑھنا

پتہ: یوسف سنز ۴۲۲۔ ای۔ بابو بازار راولپنڈی صدر

مختار احمد خاں

عمر: ۱۷ سال   تعلیم: ساتویں جماعت

دل چسپیاں: ہمدرد نونہال پڑھنا۔ لطیفے بنانا۔ سُننا

پتہ: بلاک نمبر ۹، کوارٹر نمبر ۱۔ نیپیئر پولیس اسٹیشن۔ کراچی

جاوید اختر

عمر: ۱۱ سال   تعلیم: ششم

دل چسپیاں: کرکٹ کھیلنا۔ قلمی دوستی۔ رسالے پڑھنا۔

پتہ: ۱۵۲ پی۔ آئی۔ بی کالونی۔ کراچی

محمد ہارون بلال

عمر: ۱۵ سال   تعلیم: ہفتم

دل چسپیاں: رسالے پڑھنا۔ کرکٹ و کیرم کھیلنا۔

پتہ: ۴/۴۰ انجو میاں، پتھر گھٹا۔ چار کمان

غازی محمد عبدالقیوم انصاری

عمر: ۱۳ سال   تعلیم: ہشتم

دل چسپیاں: نماز پڑھنا۔ ٹکٹ جمع کرنا۔ رسالے پڑھنا۔

پتہ: تعمیر ملت ہائی اسکول منصورہ (ڈبیر)، بلدہ ٹنڈوآدم ضلع حیدرآباد

محمد انور انور

عمر: ۱۰ سال   تعلیم: سوئم

دل چسپیاں: دل لگا کر پڑھنا۔ محنت نہ کرنے والے ساتھی کو مرغا بنانا۔

پتہ: انور اسکول۔ ٹالپر وڈا ڈاک خانہ خاص ضلع خیرپور۔

اقبال احمد شیخ

عمر: ۱۲ سال   تعلیم: نہم

دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ نماز پڑھنا۔

پتہ: یوسف سنز ۴۲۲ ای۔ بابو بازار۔ راولپنڈی صدر

اشرف علی   عمر: ۱۶ سال   تعلیم: فرسٹ ایر

دل چسپیاں: قلمی دوستی کرنا۔ رسالوں اور اخبار کا مطالعہ کرنا۔

پتہ: اشرف علی اے-۲/۲ ملیر کالونی کراچی ۲۷

فارم حلقۂ دوستی

نام: -

عمر: -

تعلیم: -

دل چسپیاں: - - - - - - - - - - - - - - - - - -

پتہ: -

حکیم حافظ محمد سعید ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے زین پیکجنگ انڈسٹریز کراچی میں چھپوا کر ادارہ مطبوعات ہمدرد ناظم آباد کراچی نمبر ۱۸ سے شائع کیا۔


دانتوں کی تکلیف کا
ایک علاج
مگر بہتر ہے
ہمدرد منجن
استعمال کریں
ہمدرد

نومبر ۱۹۶۵ء — رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۹۰۳

گیارھواں شمارہ — بارھویں جلد

ہمدرد نونہال

اس رسالے میں کیا ہے؟

قیمت: ایک رسالہ ۷۵ پیسے —— سالانہ آٹھ رُپے